نوائے اُردو

دسویں جماعت کے لیے اردو کی درسی کتاب

© NCERT
not to be republished

5012

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

NATIONAL COUNCIL OF EDUCATIONAL RESEARCH AND TRAINING

Nawa-e-Urdu
Textbook for Class X

ISBN 81-7450-686-1

پہلا اردو ایڈیشن

فروری 2007 پھاگن 1928

دیگر طباعت

جنوری **2015** ماگھ **1936**
جون **2017** اساڑھ **1939**
فروری **2018** پھالگن **1939**
جنوری **2019** ماگھ **1940**

PD 10T SPA

© نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، 2007

جُملہ حقوق محفوظ

- ناشر کی پہلے سے اجازت حاصل کیے بغیر، اس کتاب کے کسی بھی حصے کو دوبارہ پیش کرنا، یادداشت کے ذریعے بازیافت کے سسٹم میں اس کو محفوظ کرنا یا برقیاتی، میکانیکی، فوٹو کاپینگ، ریکارڈنگ کے کسی بھی وسیلے سے اس کی ترسیل کرنا منع ہے۔
- اس کتاب کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جارہا ہے کہ اسے ناشر کی اجازت کے بغیر، اس شکل کے علاوہ جس میں کہ یہ چھاپی گئی ہے یعنی، اس کی موجودہ جلد بندی اور سرورق میں تبدیلی کرکے، تجارت کے طور پر نہ تو مستعار دیا جاسکتا ہے، نہ دوبارہ فروخت کیا جاسکتا ہے، نہ کرایہ پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تلف کیا جاسکتا ہے۔
- کتاب کے صفحہ پر جو قیمت درج ہے وہ اس کتاب کی صحیح قیمت ہے۔ کوئی بھی نظرثانی شدہ قیمت چاہے وہ ربر کی مہر کے ذریعے یا چیپی یا کسی اور ذریعے ظاہر کی جائے تو وہ غلط متصوّر ہوگی اور ناقابلِ قبول ہوگی۔

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈویژن کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
شری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016 **فون** 011-26562708

108,100 فِٹ روڈ ہوسڈے کیرے **ہیلی**
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بنگلور - 560085 **فون** 080-26725740

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمدآباد - 380014 **فون** 079-27541446

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکتہ - 700114 **فون** 033-25530454

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گواہاٹی - 781021 **فون** 0361-2674869

قیمت: ₹ 90.00

اشاعتی ٹیم

ہیڈ، پبلی کیشن ڈویژن	:	محمد سراج انور
چیف ایڈیٹر	:	شویتااُپّل
چیف بزنس منیجر	:	گوتم گانگولی
چیف پروڈکشن آفیسر	:	ارون چتکارا
ایڈیٹر	:	سید پرویزاحمد
پروڈکشن اسسٹنٹ	:	اوم پرکاش

سرورق اور آرٹ
وی-منیشا اور للت کمار موریا

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ

سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، شری اروندو مارگ، نئی دہلی-110016 نے تاج پرنٹرز، 69/6A نجف گڑھ روڈ انڈسٹریل ایریا، نزد کیرتی نگر میٹرو اسٹیشن، نئی دہلی-110015 میں چھپوا کر پبلی کیشن ڈویژن سے شائع کیا۔

© NCERT not to be republished

پیش لفظ

'قومی درسیات کا خاکہ — 2005' میں سفارش کی گئی ہے کہ بچّوں کی اسکول کی زندگی ان کی باہر کی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر، کتابی علم کی اس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل ہیں۔ نئے قومی درسیات کے خاکے پر مبنی نصاب اور درسی کتابیں اسی بنیادی خیال پر عمل آوری کی ایک کوشش ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں مذکور 'تعلیم کے طفل مرکوز نظام' کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔

اس کوشش کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ سبھی اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ بچوں میں اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بچوں کو اگر موقع، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات سے وابستہ ہوکر، نئی معلومات مرتّب کرتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محل وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب مجوّزہ درسی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچّوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچوں کو بحیثیت شریک کار قبول کریں اور اُن سے اسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقررہ معلومات کا پابند نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے معمولات اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روزمرہ نظام الاوقات (Time-Table) میں لچیلا پن اُسی قدر ضروری ہے جتنی کہ سالانہ کیلینڈر کے نفاذ میں سخت محنت کی تاکہ مطلوبہ ایام کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جا سکے۔ تدریس اور اندازۂ قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعین ہوگا کہ یہ درسی کتاب، بچوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حدتک مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیلِ نو اور اسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچوں کی نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید بہتر بنانے کے لیے یہ درسی کتاب سوچنے اور محسوس کرنے کی تربیت، چھوٹے گروپوں میں بحث ومباحثہ کرنے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو زیادہ اوّلیت دیتی ہے۔

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی ''کمیٹی برائے درسی کتاب'' کی مخلصانہ کوششوں کی شکرگزار ہے۔کونسل زبانوں کے مشاورتی گروپ کے چیئر پرسن پروفیسر نامور سنگھ اور اس کتاب کے خصوصی صلاح کار پروفیسر شمیم حنفی کی ممنون ہے۔اس درسی کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا، ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکرگزار ہیں۔ہم ان سبھی اداروں اور تنظیموں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے وسائل ،مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ہم وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے شعبے برائے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جانب سے پروفیسر مرنال مری اور پروفیسر جی۔پی۔دیش پانڈے کی سربراہی میں تشکیل شدہ نگراں کمیٹی (مانیٹرنگ کمیٹی) کے اراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اور تعاون ہمیں دیا۔باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی پابند ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی، تمام مشوروں اور آرا کا خیر مقدم کرتی ہے تا کہ کتاب کو مزید غور وفکر کے بعد اور زیادہ کارآمد اور بامعنی بنایا جاسکے۔

نئی دہلی
دسمبر 2006

ڈائریکٹر
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

© NCERT
not to be republished

اس کتاب کے بارے میں

کونسل کے زیر اہتمام تیار کی جانے والی یہ کتاب ،نوائے اردوٗ دسویں جماعت کے طالب علموں کو مادری زبان کے طور پر اردو پڑھانے کے لیے ہے۔ اس کا خاص مقصد اردو زبان و ادب سے متعلق ضروری معلومات فراہم کرنا اور طلبا کی علمی، فکری اور تخلیقی استعداد کو ترقی دینا ہے۔ اسباق کے انتخاب میں طلبا کی ذہنی سطح، نفسیات اور قومی مقاصد کے ساتھ ساتھ زبان اور انداز بیان کی دلچسپی پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔ اس بات کا خیال بھی رکھا گیا ہے کہ اس سطح کے طلبا کو اردو ادب کی اہم صنفوں سے متعارف کرا دیا جائے۔ کچھ اصناف (مثلاً افسانہ، ڈراما، مضمون، غزل اور نظم) وہ پچھلی جماعت میں پڑھ چکے ہیں۔ انھیں یہاں بھی شامل کیا گیا ہے تا کہ طالب علموں کے ذہن میں ان صنفوں کا تصوّر پختہ ہو جائے۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ اردو کو صرف ادب کی زبان کے طور پر نہ پڑھایا جائے۔ اس کے علمی سرمائے کی قدر و قیمت سے بھی طلبا آگاہ ہو سکیں۔ مشمولات کے انتخاب میں بھی اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ان کے مطالعے سے طلبا میں زبان کی اچھی صلاحیت پیدا ہو اور ان کے سماجی، قومی، تہذیبی اور سائنسی شعور کی تربیت ہو۔

ہر سبق سے پہلے متعلقہ صنف اور مصنف کا تعارف کرایا گیا ہے۔ سبق کے خاتمے پر مشق میں مشکل لفظوں کے معنی، غور کرنے کی بات، سوالات اور عملی کام کے ذریعے طلبا کی فکری صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قواعد اور ادبی محاسن سے بھی واقف کرایا گیا ہے۔ کتاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ہندوستان کی لسانی تکثیر، ہندوستانی سماج اور تہذیب کی بنیادی قدروں کا عکس ابھر کر سامنے آئے۔ قومی ثقافتی ورثے، ہندوستانی آئین کے مزاج، مشترکہ تہذیبی اقدار اور تصورات نیز ماحولیات سے بھی طلبا کو آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

طلبا پر نصاب کا بوجھ زیادہ نہ ہو، اس لیے کتاب کی ضخامت قدرے کم رکھی گئی ہے۔ کتاب کی تیاری کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جو اردو اساتذہ، ماہرین تعلیم اور ایک خصوصی صلاح کار پر مشتمل تھی۔ ان سب کے اشتراک اور تعاون سے اس کتاب کو آخری شکل دی گئی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ طلبا مطلوبہ معیار کے مطابق نہ صرف اردو زبان و ادب سے متعارف ہو سکیں گے بلکہ ان میں اردو کی دوسری کتابوں کے مطالعے کا شوق بھی پیدا ہوگا۔

© NCERT not to be republished

اظہارِ تشکر

اس کتاب میں راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ’بھولا‘، سعادت حسن منٹو کا ’ نیا قانون‘، حیات اللہ انصاری کا ’بھیک‘، محمد مجیب کا ڈراما ’ آزمائش‘، سید عابد حسین کی ترجمہ کی ہوئی آپ بیتی ’چوری اور اس کا کفّارہ‘، عبدالحق کا مضمون ’مخلوط زبان‘، آل احمد سرور کا ’چکبست لکھنوی‘ اور ابن انشا کا ’اشتہارات ضرورت نہیں ہے کے‘ ، جوشؔ، اخترؔ شیرانی اور کیفیؔ اعظمی کی نظمیں اور فراقؔ کی رباعیات شامل ہیں۔کونسل ان سبھی کے وارثین کا شکریہ ادا کرتی ہے۔اسلم پرویز کا مضمون ’ماحول بچائیے‘ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔کونسل ان کا بھی شکریہ ادا کرتی ہے۔

اس کتاب میں شامل ادیبوں اور شاعروں کے اسکیچ اُن تصاویر کی بنیاد پر تیار کیے گئے ہیں جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے اردو آرکائیوز سے حاصل کی گئی ہیں۔کونسل اس کے لیے انجمن کی شکر گزار ہے۔

اس کتاب کی تیاری کے لیے کونسل کاپی ایڈیٹرز ڈاکٹر ارشاد نیر اور حسن البنّا، پروف ریڈر شبنم ناز ، ڈی ٹی پی آپریٹرز شمائلہ فاطمہ، فلاح الدین فلاحی، محمد وزیر عالم اور نرگس اسلام اور کمپیوٹر اسٹیشن انچارج پرش رام کوشک کی تہہ دل سے شکر گزار ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں خصوصی تعاون کے لیے کونسل ڈاکٹر محمد نعمان خاں (ریٹائرڈ) پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجز این سی ای آر ٹی کی بھی ممنون ہے۔

© NCERT not to be republished

کمیٹی برائے درسی کتاب

چیئرمین، مشاورتی کمیٹی برائے زبان

نامور سنگھ، پروفیسر ایمرٹس، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

خصوصی صلاح کار

شمیم حنفی، پروفیسر ایمرٹس، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

چیف کوآرڈی نیٹر

رام جنم شرما، سابق پروفیسر اور ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اراکین

آفاق حسین صدیقی، ریٹائرڈ پروفیسر، مادھو کالج، اجین

ابن کنول، پروفیسر اور صدر، شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ابوالکلام قاسمی، پروفیسر، شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اسلم پرویز، ریٹائرڈ ایسوسی ایٹ پروفیسر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اقبال مسعود، جوائنٹ سکریٹری، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال

حدیث انصاری، اسسٹنٹ پروفیسر، اِسلامیہ کریمیہ کالج، اندور

حلیمہ سعدیہ، ٹی جی ٹی، ہمدرد پبلک اسکول، سنگم وہار، نئی دہلی

شمامہ بلال، پی جی ٹی اُردو، جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول، نئی دہلی

صغرا مہدی، ریٹائرڈ پروفیسر، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

© NCERT not to be republished

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، سابق صدر شعبۂ اُردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

قدسیہ قریشی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، ستیہ وتی کالج، اشوک وہار، دہلی

ماہ طلعت علوی، ٹی جی ٹی اُردو، جامعہ مڈل اسکول، نئی دہلی

محمد فیروز، (ریٹائرڈ)، شعبۂ اردو، ذاکر حسین کالج، نئی دہلی

نعیم انیس، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، کلکتہ گرلس کالج، کولکاتا

ممبر کوآرڈی نیٹر

محمد فاروق انصاری، پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

© NCERT not to be republished

ترتیب

پیش لفظ — iii

اس کتاب کے بارے میں — v

حصّۂ نثر

افسانہ

راجندر سنگھ بیدی	بھولا	3
سعادت حسن منٹو	نیا قانون	17
حیات اللہ انصاری	بھیک	29

سوانح

الطاف حسین حالؔی	سرسید کا بچپن	39

ڈراما

محمد مجیب	آزمائش	50

آپ بیتی

سیّد عابد حسین	چوری اور اس کا کفّارہ	59

مضمون

سرسیّد احمد خاں	عورتوں کے حقوق	68

© NCERT not to be republished

مولوی عبدالحق	مخلوط زبان	73
آلِ احمد سُرور	چکبستؔ لکھنوی	80
ابن انشا	اشتہارات 'ضرورت نہیں ہے' کے	90
محمد اسلم پرویز	ماحول بچایئے	96

حصّۂ نظم

غزل

سوداؔ	بہار بے سپرِ جام و یار گزرے ہے	104
ذوقؔ	لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے	108
شادؔ عظیم آبادی	ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم	112
فانیؔ	دنیا میری بلا جانے، مہنگی ہے یا سستی ہے	116
اصغرؔ گونڈوی	آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا	119
یاسؔ یگانہؔ چنگیزی	ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا	123

نظم

اکبرؔ الہ آبادی	جلوۂ دربارِ دہلی	129
اقبالؔ	حقیقتِ حسن	135
جوشؔ	گرمی اور دیہاتی بازار	139
اخترؔ شیرانی	اُو دیس سے آنے والے بتا!	145
کیفیؔ اعظمی	آندھی	151

رباعی

انیسؔ	گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں	156
	رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے	

© NCERT not to be republished

تلوک چند محرؔوم	فطرت کی دی ہوئی مسرت کھوکر	160
	مذہب کی زباں پر ہے نکوئی کا پیام	
فراقؔ	اک حلقۂ زنجیر تو زنجیر نہیں	164
	ہر عیب سے مانا کہ جدا ہو جائے	

© NCERT
not to be republished

بھارت کا آئین

تمہید

ہَم بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بھارَت کو ایک مقتدر، سماَ ج وَادی، غیر مَذہَبی عَوامی جَمہُوریَہ بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں۔

انصاف سماجی، معاشی اور سیاسی

آزادی خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت

مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع اور ان سب میں

اخوت کو ترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن ہو۔

اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج چھبیس نومبر 1949ء کو یہ آئین ذریعہ ہذا اختیار کرتے ہیں، وضع کرتے ہیں اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں۔

1۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''مقتدر عوامی جمہوریہ'' کی جگہ (3-1-1977 سے)

2۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''قوم کے اتحاد'' کی جگہ (3-1-1977 سے)

© NCERT not to be republished

حصۂ نثر

- افسانہ
- سوانح
- ڈراما
- آپ بیتی
- مضمون

© NCERT not to be republished

افسانہ

افسانہ بیسویں صدی کے آغاز کی پیداوار ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے والوں کے لیے مختصر افسانہ خاص کشش رکھتا ہے۔

افسانہ اس کہانی کو کہتے ہیں جس میں زندگی کی سچائیوں کا بیان ہوتا ہے۔ نقادوں نے افسانے کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ ایک نقاد نے کہا ہے کہ افسانہ ایسی نثری تخلیق ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے۔ ایک اور نقاد کا قول ہے کہ افسانے میں بنیادی چیز وحدت تاثر ہے۔ نقادوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ افسانوں کے کردار ہماری زندگی اور تجربوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔

افسانہ (کہانی) اختصار کے ساتھ زندگی کے کسی اہم گوشے کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ مختصر ہونے کی وجہ سے واقعات میں جھول ہونے کے اندیشے بھی کم ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار کا مشاہدہ اور انسانی نفسیات کا مطالعہ گہرا ہوتا ہے۔

اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں پریم چند، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، غلام عباس، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان کے بعد نئے افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد بھی ہمارے سامنے آ چکی ہے۔ اردو کی ادبی اصناف میں افسانے کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ بہت سے اردو افسانے دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیے جا چکے ہیں۔

© NCERT not to be republished

راجندر سنگھ بیدی

(1915 – 1984)

راجندر سنگھ بیدی تحصیل ڈسکا ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ گئے۔ 1932 میں طالب علمی کے زمانے میں انگریزی، اردو اور پنجابی میں نظمیں اور کہانیاں لکھنے لگے تھے۔ کچھ مدت بعد پوسٹ آفس لاہور میں کلرک ہو گئے۔ 1943 میں ڈاک خانے کی ملازمت سے مستعفی ہو کر مرکزی حکومت کے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ میں کام کیا اور اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں بحیثیت اسٹاف آرٹسٹ کام کرنے لگے۔ 1948 میں جموں ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر بنائے گئے لیکن ایک ہی سال میں استعفیٰ دے کر بمبئی چلے گئے اور فلموں کے لیے لکھنے لگے۔ ان کے افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ''دانہ و دام''(1965) ''گرہن'' (1942) آزادی سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔ ''کوکھ جلی'' (1949)، ''اپنے دکھ مجھے دے دو''(1965)، ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے''(1974) اور ''مکتی بودھ'' (1982) آزادی کے بعد منظر عام پر آئے۔ ڈراموں کے دو مجموعے ''بے جان چیزیں''(1943) اور ''سات کھیل''(1946) شائع ہوئے۔ راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ ''ایک چادر میلی سی''(1962) ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور ہوا۔ راجندر سنگھ بیدی نے کچھ فلمیں بھی بنائیں جن میں ''دستک'' خاصی مشہور ہوئی۔ ''مرزا غالب''، ''دیوداس''، ''مدھومتی'' اور ''انورادھا'' میں بیدی کے مکالمے بہت مشہور ہوئے۔

بیدی کے افسانوں میں ایک ہمدرد انسان کی نرمی اور دردمندی ہے۔ وہ ہر چیز کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں۔ بیدی نے اپنے افسانوں میں نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور کنایے وضع کیے ہیں۔

© NCERT not to be republished

5012CH01

بھولا

میں نے مایا کو پتھر کے ایک کوزے میں مکھن رکھتے دیکھا۔ چھاچھ کی کھٹاس کو دور کرنے کے لیے مایا نے کوزے میں پڑے ہوئے مکھن کو کنوئیں کے صاف پانی سے کئی بار دھویا۔اس طرح مکھن کے جمع کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ایسی بات عموماً مایا کے کسی عزیز کی آمد کا پتہ دیتی تھی۔ہاں! اب مجھے یاد آیا دودن کے بعد مایا کا بھائی اپنی بیوہ بہن سے راکھی بندھوانے کے لیے آنے والا تھا۔یوں تو اکثر بہنیں بھائیوں کے یہاں جا کر انھیں راکھی باندھتی ہیں،مگر مایا کا بھائی اپنی بہن اور بھانجے سے ملنے کے لیے خود ہی آجایا کرتا تھا اور راکھی بندھوالیا کرتا تھا۔راکھی بندھوا کر وہ اپنی بیوہ بہن کو یقین دلاتا تھا کہ اگرچہ اس کا سہاگ لٹ گیا ہے مگر جب تک اس کا بھائی زندہ ہے،اس کی رکھشا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتا ہے۔ننھے بھولے نے میرے اس خیال کی تصدیق کردی۔گنا چوستے ہوئے اس نے کہا ’’بابا! پرسوں ماموں جی آئیں گے نا۔۔۔؟‘‘

میں نے اپنے پوتے کو پیار سے گود میں اٹھالیا۔بھولے کا جسم بہت نرم ونازک تھا اور اس کی آواز بہت سریلی تھی جیسے کنول کی نزاکت اور سپیدی، گلاب کی سرخی اور بلبل کی الحانی کو اکٹھا کردیا ہو۔اگرچہ بھولا میری لمبی اور گھنی داڑھی سے گھبرا کر مجھے اپنا منہ چومنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔تاہم میں نے زبردستی اس کے سرخ گالوں پر پیار کی مہر ثبت کردی۔میں نے مسکراتے ہوئے کہا

’’بھولے — تیرے ماموں جی ...... تیری ماتا جی کے کیا ہوتے ہیں؟‘‘

بھولے نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا۔’’ماموں جی۔‘‘

مایا نے استوتر پڑھنا چھوڑ دیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ میں اپنی بہو کے اس طرح کھل کر ہنسنے پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔مایا بیوہ تھی اور سماج اسے اچھے کپڑے پہننے اور خوشی کی بات میں حصہ لینے سے بھی روکتا تھا۔ میں نے بارہا مایا کو اچھے کپڑے پہننے، ہنسنے، کھیلنے کی تلقین کرتے ہوئے سماج کی پروا نہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ مگر مایا نے ازخود اپنے آپ کو سماج کے روح فرسا احکام کے تابع کرلیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک صندوق میں مقفّل کر کے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دی تھی۔

مایا نے ہنستے ہوئے اپنا پاٹھ جاری رکھا۔

© NCERT not to be republished

ہری ہر، ہری ہر، ہری ہر، ہری
میری بار کیوں دیر اتنی کری

پھر اس نے اپنے لال کو پیار سے بلاتے ہوئے کہا۔

''بھولے — تم ننھی کے کیا ہوتے ہو؟''

''بھائی!'' بھولے نے جواب دیا۔

''اسی طرح تیرے ماموں جی میرے بھائی ہیں۔''

بھولا یہ بات نہ سمجھ سکا کہ ایک شخص کس طرح ایک ہی وقت میں کسی کا بھائی اور کسی کا ماموں ہوسکتا ہے۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ اس کے ماموں جان اس کے بابا جی کے بھی ماموں جی ہیں۔ بھولے نے اس مخمصے میں پڑنے کی کوشش نہ کی اور اچک کر ماں کی گود میں جا بیٹھا اور اپنی ماں سے گیتا سننے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ وہ گیتا محض اس وجہ سے سنتا تھا کہ وہ کہانیوں کا شوقین تھا اور گیتا کے ادھیائے کے آخر میں مہاتم سن کر وہ بہت خوش ہوتا اور پھر جوہڑ کے کنارے اُگی ہوئی دوب کی مخملی تلواروں میں بیٹھ کر گھنٹوں ان مہاتموں پر غور کیا کرتا۔

مجھے دوپہر کو اپنے گھر سے چھ میل دور اپنے مزرعوں میں پہنچنا ہوتا تھا۔ بوڑھا جسم، اس پر مصیبتوں کا مارا ہوا جوانی کے عالم میں تین تین من بوجھ اٹھا کر دوڑا کیا مگر اب بیس سیر بوجھ کے نیچے گردن چٹخنے لگتی ہے۔ بیٹے کی موت نے امید کو یاس میں تبدیل کر کے کمر توڑ دی تھی۔ اب میں بھولے کے سہارے ہی جیتا تھا ورنہ دراصل تو مر چکا تھا۔

رات کو میں تکان کی وجہ سے بستر پر لیٹتے ہی اونگھنے لگا۔ ذرا توقف کے بعد مایا نے مجھے دودھ پینے کے لیے آواز دی۔ میں اپنی بہو کی سعادت مندی پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور اسے سیکڑوں دعائیں دیتے ہوئے میں نے کہا۔

''مجھ بوڑھے کی اتنی پروا نہ کیا کرو بٹیا۔''

— بھولا ابھی تک نہ سویا تھا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور میرے پیٹ پر چڑھ گیا، بولا۔

''بابا جی! آپ آج کہانی نہیں سنائیں گے کیا؟''

''نہیں بیٹا — میں نے آسمان پر نکلے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔'' میں آج بہت تھک گیا ہوں — کل دوپہر کو تمھیں سناؤں گا۔''

بھولے نے روٹھتے ہوئے جواب دیا۔'' میں تمھارا بھولا نہیں بابا۔ میں ماتا جی کا بھولا ہوں۔''

بھولا بھی جانتا تھا کہ میں نے اس کی ایسی بات کبھی برداشت نہیں کی۔ میں ہمیشہ اس سے یہی سننے کا عادی تھا کہ ''بھولا بابا جی کا ہے ماتا جی کا نہیں۔'' مگر اس دن ہلوں کو کندھے پر اٹھا کر چھ میل تک لے جانے اور پیدل ہی واپس آنے کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا۔ شاید میں اتنا نہ تھکتا اگر میرا نیا جوتا ایڑی کو نہ دباتا اور اس وجہ سے میرے پاؤں میں ٹیسیں نہ اٹھتیں۔ اس غیر معمولی تھکن کے باعث میں نے بھولے کی وہ بات بھی برداشت کی۔ میں آسمان میں ستاروں کو دیکھنے لگا۔ آسمان کے جنوبی گوشے میں ایک ستارہ مشعل کی طرح روشن تھا۔ غور سے دیکھنے پر وہ مدھم ہونے لگا— میں اونگھتے اونگھتے سو گیا۔

صبح ہوتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ بھولا سوچتا ہوگا کہ کل رات بابا نے میری بات کس طرح برداشت کی؟ میں اس خیال سے لرز گیا کہ بھولے کے دل میں کہیں یہ خیال نہ آیا ہو کہ اب بابا میری پروا نہیں کرتے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ صبح کے وقت اس نے میری گود میں آنے سے انکار کر دیا اور بولا۔

''میں نہیں آؤں گا۔ تیرے پاس بابا۔''

''کیوں بھولے؟''

''بھولا بابا جی کا نہیں— بھولا ماتا جی کا ہے۔''

میں نے بھولے کو مٹھائی کے لالچ سے منا لیا، اور چند ہی لمحات میں بھولا بابا جی کا بن گیا اور اپنی ننھی ٹانگوں کے گرد میرے جسم سے لپٹے ہوئے کمبل کو لپیٹنے لگا۔ مایا ہری ہر استوتر پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے پاؤ بھر مکھن نکالا اور اسے کوزے میں ڈال کر کنویں کے صاف پانی سے چھاچھ کی کھٹاس کو دھو ڈالا۔ اب مایا نے اپنے بھائی کے لیے سیر کے قریب مکھن تیار کر لیا تھا۔ میں بہن بھائی کے اس پیار کے جذبے پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اتنا خوش کہ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے دل میں کہا، عورت کا دل محبت کا ایک سمندر ہوتا ہے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی، خاوند، بچے سب سے وہ بہت ہی پیار کرتی ہے اور اتنا کرنے پر بھی وہ ختم نہیں ہوتا۔ ایک دل کے ہوتے ہوئے بھی وہ سب کو اپنا دل دے دیتی ہے۔ بھولے نے دونوں ہاتھ میرے گالوں کی جھریوں پر رکھے مایا کی طرف سے چہرے کو ہٹا کر اپنی طرف کر لیا اور بولا۔

''بابا تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے نا—؟''

''کس بات کا بیٹا؟''

''تمھیں آج دوپہر کو مجھے کہانی سنانی ہے۔''

''ہاں بیٹا۔'' میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔

یہ تو بھولا ہی جانتا ہوگا کہ اس نے دو پہر کے آنے کا کتنا انتظار کیا۔ بھولے کو اس بات کا علم تھا کہ باباجی کے کہانی سنانے کا وقت وہی ہوتا ہے جب وہ کھانا کھا کر اس پلنگ پر جا لیٹتے ہیں جس پر وہ باباجی یا ماتا جی کی مدد کے بغیر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ چنانچہ وقت سے آدھ گھنٹے پیشتر ہی اس نے کھانا نکلوانے پر اصرار شروع کر دیا۔ میرے کھانے کے لیے نہیں بلکہ اپنی کہانی سننے کے چاؤ سے۔

میں نے معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے کھانا کھایا۔ ابھی آخری نوالہ میں نے توڑا ہی تھا کہ پٹواری نے دروازے پر دستک دی۔ اس کے ہاتھ میں ہلکی سی ایک جریب تھی۔ اس نے کہا کہ خانقاہ والے کنویں پر آپ کی زمین کو ناپنے کے لیے مجھے آج ہی فرصت مِل سکتی ہے، پھر نہیں۔

دالان کی طرف نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا، بھولا چارپائی کے چاروں طرف گھوم کر بستر بچھا رہا تھا۔ بستر بچھانے کے بعد اس نے ایک بڑا سا تکیہ بھی ایک طرف رکھ دیا اور پائینتی پر پاؤں اڑا کر چارپائی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ بھولے کا اصرار مجھے جلد روٹی کھلانا اور بستر بچھا کر میری تواضع کرنا اپنی خودغرضی پر مبنی تھا تاہم میرے خیال میں آیا—

''آخر مایا کا بیٹا ہی ہے نا—ایشور اس کی عمر دراز کرے۔''

میں نے پٹواری سے کہا تم خانقاہ والے کنویں کو چلو اور میں تمھارے پیچھے پیچھے آجاؤں گا۔ جب بھولے نے دیکھا کہ میں باہر جانے کے لیے تیار ہوں تو اس کا چہرہ اس طرح مدھم پڑ گیا جس طرح گزشتہ شب آسمان کے ایک کونے میں مشعل کی مانند روشن ستارہ مسلسل دیکھتے رہنے کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا۔ مایا نے کہا۔

''باباجی اتنی بھی کیا جلدی ہے؟—خانقاہ والا کنواں کہیں بھاگا تو نہیں جاتا— آپ کم سے کم آرام تو کرلیں۔''

''اوں ہوں—''میں نے زیرِلب کہا۔''پٹواری چلا گیا تو یہ کام ایک ماہ سے ادھر نہ ہو سکے گا۔''

مایا خاموش ہوگئی۔ بھولا منہ بسورنے لگا۔ اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ اُس نے کہا۔''بابا میری کہانی، میری کہانی—''

''بھولے—میرے بچے۔''میں نے بھولے کو ٹالتے ہوئے کہا۔''دن کو کہانی سُنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔''

''راستہ بھول جاتے ہیں؟''بھولے نے سوچتے ہوئے کہا۔''بابا تم جھوٹ بولتے ہو—میں باباجی کا بھولا نہیں بنتا۔''

''اب جب کہ میں تھکا ہوا بھی نہیں تھا اور پندرہ بیس منٹ استراحت کے لیے نکال سکتا تھا بھلا بھولے کی اس بات کو آسانی سے کس طرح برداشت کر لیتا۔ میں نے اپنے شانے سے چادر اُتار کر چارپائی کی پائینتی پر رکھی اور اپنی دبتی ہوئی ایڑی کو جوتی کی قید سے نجات دلاتے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ بھولا پھر اپنے بابا کا بن گیا۔ لیٹتے ہوئے میں نے بھولے سے کہا۔

''اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے تو اس کے تم ذمہ دار ہو۔''

اور میں نے بھولے کو دو پہر کے وقت سات شہزادوں اور سات شہزادیوں کی ایک لمبی کہانی سنائی۔کہانی میں ان کی باہمی شادی کو میں نے معمول سے زیادہ دلکش انداز میں بیان کیا۔بھولا ہمیشہ اس کہانی کو پسند کرتا تھا جس کے آخر میں شہزادہ اور شہزادی کی شادی ہوجائے۔مگر میں نے اس روز بھولے کے منہ پر خوشی کی کوئی علامت نہ دیکھی بلکہ وہ افسردہ سا منہ بنائے خفیف طور پر کانپتا رہا۔

اس خیال سے کہ پٹواری خانقاہ والے کنویں پر انتظار کرتے کرتے تھک کر اپنی ہلکی ہلکی جھنکار پیدا کرنے والی جریب جیب میں ڈال کر کہیں اپنے گاؤں کا رُخ نہ کرلے میں جلدی جلدی مگر اپنے نئے جوتے میں دبتی ہوئی ایڑی کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا بھاگا۔گو مایا نے جوتی کو سرسوں کا تیل لگادیا تھا تاہم وہ نرم مطلق نہ ہوئی تھی۔

شام کو جب میں واپس آیا تو میں نے بھولے کو خوشی سے دالان سے صحن میں اور صحن سے دالان میں کودتے پھاندتے دیکھا۔وہ لکڑی کے ایک ڈنڈے کو گھوڑا بنا کر اسے بھگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

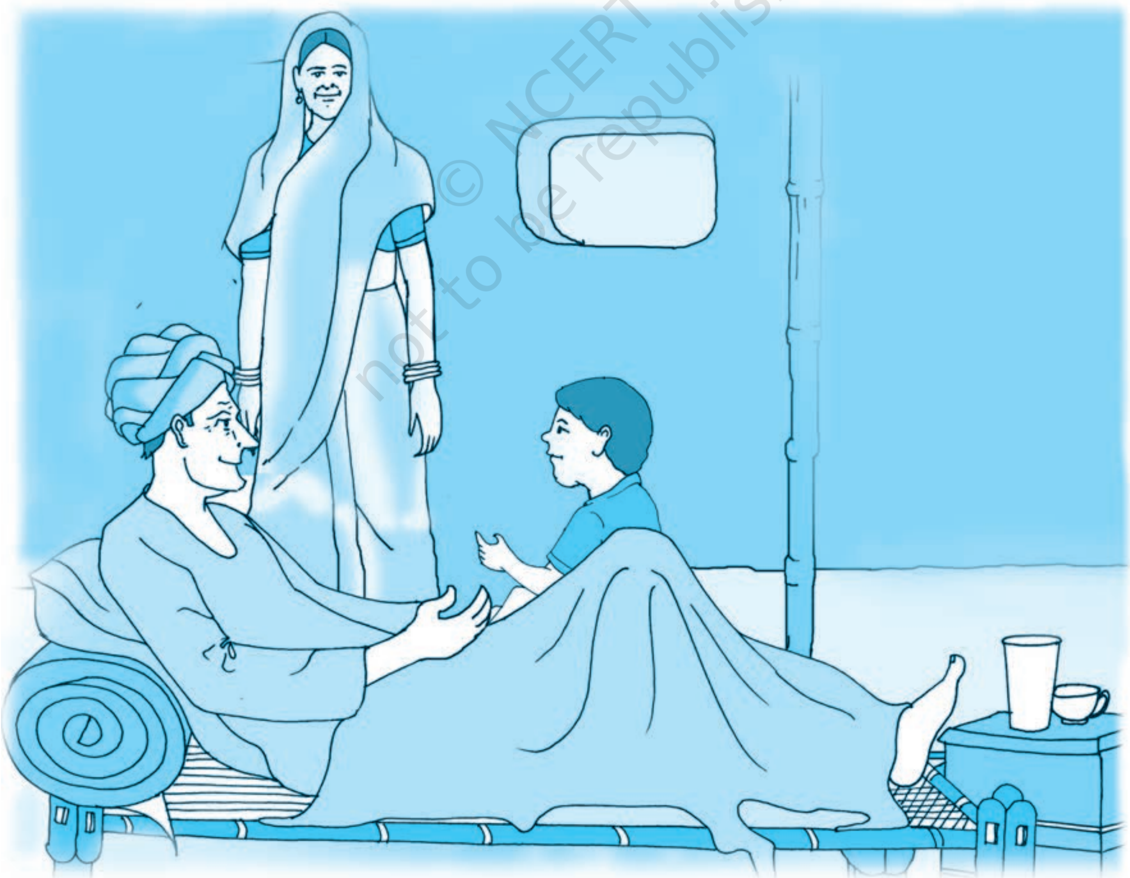

© NCERT not to be republished

''چل ماموں جی کے دیس — رے گھوڑے، ماموں جی کے دیس۔

ماموں جی کے دیس، ہاں، ہاں! ماموں جی کے دیس۔ گھوڑے ....''

جوں ہی میں نے دہلیز میں قدم رکھا۔ بھولے نے اپنا گانا ختم کر دیا اور بولا

''بابا — آج ماموں جان آئیں گے نا —؟''

''پھر کیا ہوگا بھولے —؟'' میں نے پوچھا۔

''ماموں جان اگن بوٹ لائیں گے۔ ماموں جی کلو (کتا) لائیں گے۔ ماموں جی کے سر پر مکّی کے بھٹّوں کا ڈھیر ہوگا نا بابا — ہمارے یہاں تو مکّی ہوتی ہی نہیں بابا اور تو اور ..... ایسی مٹھائی لائیں گے جو آپ نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔''

میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس خوبی سے ''خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی'' کے الفاظ سات شہزادوں اور سات شہزادیوں والی کہانی کے بیان میں سے اس نے یاد رکھے تھے۔ ''جیتا رہے'' میں نے دُعا دیتے ہوئے کہا۔ ''بہت ذہین لڑکا ہوگا اور ہمارے نام کو روشن کرے گا۔''

شام ہوتے ہی بھولا دروازے میں جا بیٹھا تاکہ ماموں جی کی شکل دیکھتے ہی اندر کی طرف دوڑے اور پہلے پہل اپنی ماتا جی کو اور پھر مجھے اپنے ماموں جی کے آنے کی خبر سُنائے۔

دیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا۔ دِیوں کی روشنی زیادہ ہوتی جاتی۔ متفکرانہ لہجے میں مایا نے کہا۔

''بابا جی — بھیا ابھی تک نہیں آئے۔''

''کسی کام کی وجہ سے ٹھہر گئے ہوں گے۔''

''ممکن ہے کوئی ضروری کام آ پڑا ہو — راکھی کے روپے ڈاک میں بھیج دیں گے۔''

''مگر راکھی؟''

''ہاں راکھی کی کہو .... انھیں اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔''

میں نے بھولے کو زبردستی دروازے کی دہلیز پر سے اٹھایا۔ بھولے نے اپنی ماتا جی سے بھی زیادہ متفکرانہ لہجے میں کہا ''ماتا جی — ماموں جی کیوں نہیں آئے؟''

مایا نے بھولے کو گود میں اُٹھاتے ہوئے اور پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید صبح کو آ جائیں — تیرے ماموں جی —

© NCERT not to be republished

میرے بھولے!''

پھر بھولے نے اپنے نرم و نازک بازوؤں کو اپنی ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔'' میرے ماموں جی تمھارے کیا ہوتے ہیں؟''

''جو تم ننھی کے ہو۔''

''بھائی؟''

''تم جانو—''

''اور بنسی (بھولے کا دوست) کے کیا ہوتے ہیں۔''

''کچھ بھی نہیں—''

''بھائی بھی نہیں؟''

''نہیں—''

—اور بھولا اس عجیب بات کو سوچتا ہوا سو گیا۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو پھر وہ مشعل کی مانند چمکتا ہوا ستارہ آسمان کے ایک کونے میں میرے گھورنے کی وجہ سے ماند ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے پھر بھولے کا چہرہ یاد آ گیا جو میرے خانقاہ والے کنویں کو جانے پر تیار ہونے کی وجہ سے یوں ہی ماند پڑ گیا تھا۔ کتنا شوق ہے بھولے کو کہانی سننے کا۔ وہ اپنی ماں کو استوتر بھی پڑھنے نہیں دیتا۔ اتنا چھوٹا بچہ بھلا گیتا کو کیا سمجھے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ اس کے ادھیائے کا مہاتم ایک دلچسپ کہانی ہوتی ہے وہ نہایت صبر سے ادھیائے کے ختم اور مہاتم کے شروع ہونے کا انتظار کیا کرتا ہے۔

''مایا کا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔ شاید نہ آئے۔'' میں نے دل میں کہا۔'' اُسے اپنی بہن کا پیار سے جمع کیا ہوا مکھن کھانے کے لیے تو آ جانا چاہیے تھا۔'' میں ستاروں کی طرف دیکھتے دیکھتے اُونگھنے لگا۔ یکا یک مایا کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ وہ دودھ کا کٹورا لیے کھڑی تھی۔

''میں نے کئی بار کہا ہے— تم میرے لیے اتنی تکلیف نہ کیا کرو—'' میں نے کہا،

دودھ پینے کے بعد فرطِ شفقت سے میرے آنسو نکل آئے۔ حد سے زیادہ خوش ہوکر میں مایا کو یہی دُعا دے سکتا تھا کہ وہ سہاگ وتی رہے۔ کچھ ایسا ہی میں نے کہنا چاہا۔ مگر اس خیال کے آنے سے کہ اس کا سہاگ تو برس ہوئے لٹ گیا تھا میں نے کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے اپنی رقّت کو دباتے ہوئے کہا،

© NCERT not to be republished

''بیٹی— تمھیں اس سیوا کا پھل ملے بغیر نہ رہے گا۔''

پھر میرے پہلو میں بچھی ہوئی چارپائی پر سے بھولا ننھی کو جو کہ اُس کے ساتھ ہی سو رہی تھی، پرے ڈھکیلتے ہوئے اور آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھا۔ اُٹھتے ہی اس نے کہا،

''بابا—ماموں جی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟''

''آجائیں گے—بیٹا، سو جاؤ۔ وہ صبح سویرے آجائیں گے۔''

اپنے بیٹے کو اپنے ماموں کے لیے اس قدر بیتاب دیکھ کر مایا بھی کچھ بیتاب ہوگئی۔ عین اس طرح جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھولے کو لٹا کر تھپکنے لگی۔

مایا کی آنکھوں میں بھی نیند آنے لگی، یوں بھی جوانی میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور پھر دن بھر کام کاج کر کے تھک جانے کی وجہ سے مایا گہری نیند سوتی تھی۔ میری نیند تو عام بوڑھوں کی سی نیند تھی۔ کبھی ایک آدھ گھنٹے تک سو لیتا پھر دو گھنٹے جاگتا رہتا۔ پھر کچھ دیر اونگھنے لگ جاتا اور باقی رات اختر شماری کرتے گزار دیتا۔ میں نے مایا کو سو جانے کے لیے کہا اور بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا۔

''بتی جلتی رہنے دو، صرف دھیمی کر دو— میلے کی وجہ سے بہت سے چور چکار اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں—'' میں نے سوئی ہوئی مایا سے کہا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس دفعہ میلے پر جو لوگ آئے تھے ان میں ایسے آدمی بھی تھے جو کہ ننھے ننھے بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے تھے۔ پڑوس کے ایک گاؤں میں دو ایک ایسی وارداتیں ہوئی تھیں اور اسی لیے میں نے بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا۔ میں نے دیکھا بھولا جاگ رہا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو میں نے بتی کو دیوار پر نہ دیکھا۔ گھبرا کر ہاتھ پسارا تو میں نے دیکھا کہ بھولا بھی بستر پر نہ تھا۔ میں نے اندھوں کی طرح در و دیوار سے ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے— تمام چارپائیوں پر دیکھا، مایا کو جگایا۔ گھر کا کونہ کونہ چھانا۔ بھولا کہیں نہ تھا—!

''مایا— ہم لٹ گئے۔'' میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔

مایا ماں تھی۔ اس کا کلیجہ جس طرح شق ہوا یہ کوئی اسی سے پوچھے۔ اپنا سہاگ لٹنے پر اس نے اتنے بال نہ نوچے تھے جتنے کہ اس وقت نوچے۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح چیخیں مار رہی تھی۔ پاس پڑوس کی عورتیں شور سن کر جمع ہوگئیں اور بھولے کی گمشدگی کی خبر سن کر رونے پیٹنے لگیں۔

© NCERT not to be republished

میں عورتوں سے زیادہ پیٹ رہا تھا۔آج میں نے ایک بازی گرکو اپنے گھر کے اندر گھورتے بھی دیکھا تھا مگر میں نے پروا نہیں کی تھی۔آہ! وہ وقت کہاں سے ہاتھ آئے میں نے دعائیں کیں کہ کسی وقت کا دیا کام آجائے۔منّتیں مانیں کہ بھولا مل جائے۔وہی اندھیرے گھر کا اجالا تھا۔اسی کے دم سے میں اور مایا جیتے تھے۔اسی کے آس سے ہم اُڑے پھرتے تھے۔وہی ہماری آنکھوں کی بینائی، وہی ہمارے جسم کی توانائی تھا۔اس کے بغیر ہم کچھ نہ تھے۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔مایا بے ہوش ہوگئی تھی۔اس کے ہاتھ اندر کی طرف مڑ گئے تھے، نسیں کھنچی ہوئی اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور عورتیں اس کی ناک بند کرکے ایک چمچے سے اس کے دانت کھولنے کی کوشش کررہی تھیں۔

میں سچ کہتا ہوں ایک لمحے کے لیے میں بھولے کو بھی بھول گیا۔میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ایک ساتھ گھر کے دو بشر جب دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلے جائیں تو اس وقت دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔میں نے لرزتے ہوئے ایشور کو برا بھلا کہا کہ ان دکھوں کے دیکھنے سے پیشتر اس نے میری ہی جان کیوں نہ لے لی۔آہ! مگر جس کی قضا آتی ہے اس کے سوا کسی اور کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔

قریب تھا کہ میں بھی مایا کی طرح گر پڑوں کہ مایا ہوش میں آگئی۔مجھے پہلے سے کچھ سہارا ملا۔میں نے دل میں کہا۔''میں ہی مایا کو سہارا دے سکتا ہوں اور اگر میں خود اس طرح حوصلہ چھوڑ دوں تو مایا کسی طرح نہیں بچ سکتی''۔میں نے حواس جمع کرتے ہوئے کہا،

''مایا بیٹی — دیکھو! مجھے یوں خانہ خراب مت کرو — حوصلہ کرو۔بچّے اغوا ہوتے ہیں مگر آخر مل بھی جاتے ہیں۔بازی گر بچوں کو مارنے کے لیے نہیں لے جاتے۔پال کر بڑا کرکے کسی کام میں لانے کے لیے لے جاتے ہیں — بھولا مل جائے گا۔''

ماں کے لیے یہ الفاظ بے معنی تھے۔مجھے بھی اپنے اس طرح صبر کرنے پر گمان ہوا۔گویا میں اس وجہ سے چپ ہوگیا ہوں کہ مجھے مایا کے مقابلے میں بھولے سے بہت کم پیار ہے۔مگر ''نہیں'' — میں نے کہا۔''آدمی کو ضرور کچھ حوصلہ دکھانا چاہیے۔''

اس وقت آدھی رات ادھر تھی اور آدھی اُدھر۔جب ہمارا پڑوسی اس حادثے کی خبر تھانے میں پہنچانے کے لیے جو گاؤں سے دس کوس دور شہر میں تھا، روانہ ہوا۔

باقی ہم سب ہاتھ ملتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگے تاکہ دن نکلنے پر کچھ سجھائی دے۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور ہم نے بھولے کے ماموں کو اندر آتے دیکھا۔اس کی گود میں بھولا تھا۔اس کے سر پر مٹھائی کی ٹوکریاں اور ایک ہاتھ میں بتی تھی۔ہمیں تو گویا دنیا کی تمام دولت مل گئی۔مایا نے بھائی کو پانی پوچھا نہ خیریت اور اس کی گود سے بھولے کو چھین کر

© NCERT not to be republished

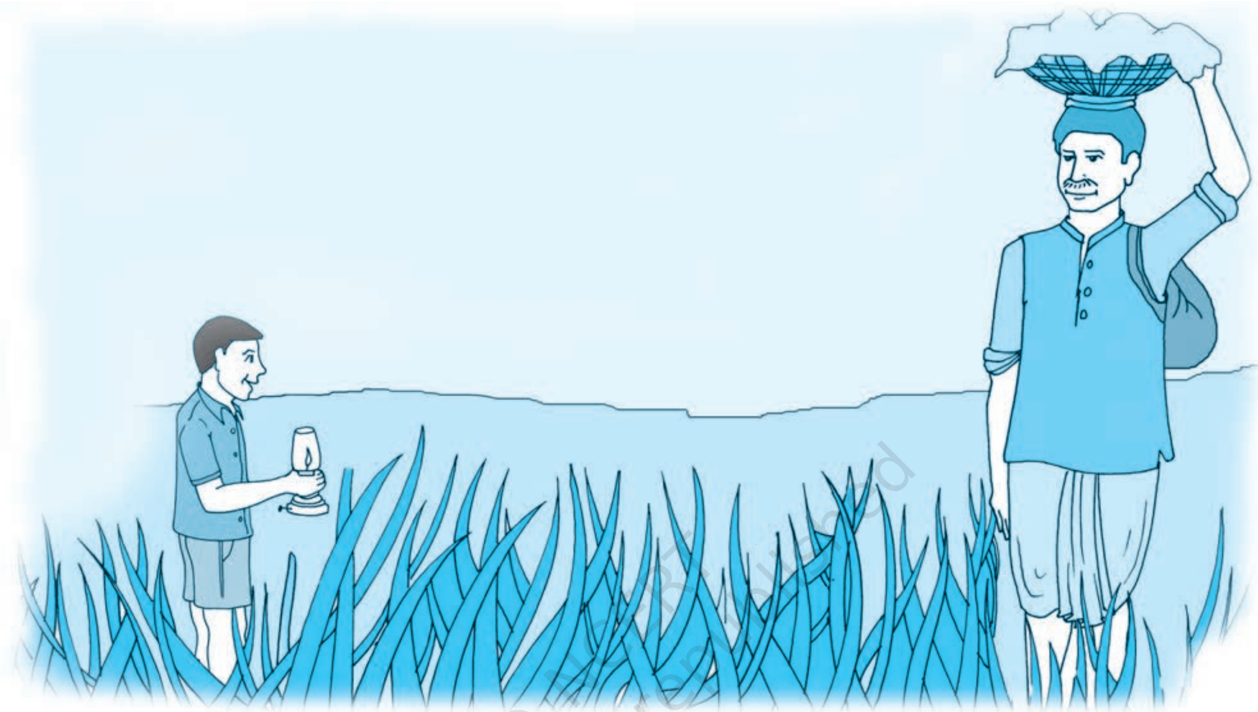

اسے چومنے لگی۔ تمام اڑوس پڑوس نے مبارک باد دی۔ بھولے کے ماموں نے کہا—

مجھے کسی کام کی وجہ سے دیر ہوگئی تھی۔ دیر سے روانہ ہونے پر شب کی تاریکی میں میں اپنا راستہ گم کر بیٹھا تھا۔ یکا یک مجھے ایک جانب سے روشنی آتی دکھائی دی میں اس کی جانب بڑھا۔ اس خوفناک تاریکی میں پرس پور سے آنے والی سڑک پر بھولے کو بتی پکڑے ہوئے کانٹوں میں الجھے ہوئے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اس کے اس وقت وہاں ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا ”— کہ بابا جی نے آج دوپہر کے وقت مجھے کہانی سنائی تھی اور کہا تھا کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تم دیر تک نہ آئے تو میں نے یہی جانا کہ تم راستہ بھول گئے ہوگے اور بابا نے کہا تھا اگر کوئی مسافر راستہ بھول گیا تو تم ذمہ دار ہوگے نا—!!“

— راجندر سنگھ بیدی

مشق

لفظ و معنی:

کوزہ	:	مٹی کا چھوٹا پیالہ، کُلّھڑ
سپیدی	:	سفیدی
خوش الحان	:	اچھی آواز والا
ثبت کرنا	:	نشان بنانا، نقش بٹھانا
روح فرسا	:	روح کو تکلیف دینے والا
تابع	:	تحت، پابند
جوہڑ	:	چھوٹا تالاب، گڑھا
دوب	:	ہری نرم چھوٹی گھاس
مقفّل	:	تالا لگا ہوا، بند
مخمصے (مخمصہ)	:	اُلجھن، جھنجھٹ
ادھیائے	:	باب
استوتر	:	وہ اشلوک جس میں ایشور کی تعریف کی گئی ہو
مَزرَع	:	کھیتی
یاس	:	ناامیدی، مایوسی
توقّف	:	وقفہ
خانقاہ	:	کسی پیر، بزرگ یا صوفی کے رہنے اور عبادت کرنے کی جگہ
پٹواری	:	زمین ناپنے والا سرکاری ملازم
جَریب	:	ناپنے والی زنجیر (پیمانہ)، وہ زنجیر جس سے زمین کی پیائش کی جاتی ہے

© NCERT not to be republished

پائینتی	:	پلنگ یا چارپائی کا وہ حصہ جدھر پیر کیے جاتے ہیں
تواضع	:	خاطرمدارات
مبنی	:	منحصر
زیرِلب	:	ہونٹوں ہونٹوں میں، آہستہ
نمناک	:	بھیگا ہوا
استراحت	:	آرام
شانہ	:	کندھا
قیدِ بامشقت	:	قید کی وہ سزا جس میں محنت بھی شامل ہو۔
نجات	:	رہائی، آزادی، چھٹکارا
دہلیز	:	چوکھٹ
اَگن بوٹ	:	بھاپ سے چلنے والی کشتی
سہاگ وتی	:	سہاگن، جس کا شوہر زندہ ہو
نام روشن کرنا (محاورہ)	:	شہرت ہونا، مشہور ہونا
متفکرانہ	:	غوروفکر کے انداز میں
فرطِ مسرت	:	خوشی کی زیادتی
رِقّت	:	رونے کی کیفیت، روہانسا ہونا
غلبہ	:	فتح، کامیابی، برتری
اختر شماری	:	ستارے گِننا
شق ہونا	:	پھٹنا، ٹکڑے ٹکڑے ہونا
منّت ماننا	:	نذر ماننا، مراد پوری ہونے پر عبادت کرنے یا صدقہ کرنے کی نیت کرنا
پتھرائی آنکھ	:	بے حس وحرکت یا ٹھہری ہوئی آنکھ
خانہ خراب	:	جس کا گھر برباد ہوجائے
ششدر	:	ہکّا بکّا، حیران

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- اس افسانے میں بھولا کی بھولی بھالی باتیں، اس کی ذہانت اور شرارت اور پھر اچانک اس کا غائب ہوجانا دلچسپ اور پُر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔
- افسانے میں بھولا کے کردار کے ذریعے ایک بچے کی نفسیات بڑی خوبی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔
- اُس زمانے میں بیوہ عورت کا سماج میں کوئی مقام نہیں تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ جس عورت کا شوہر مر گیا ہو اُسے دنیا میں جینے کا حق نہیں۔ نہ تو وہ اچھا کھانا کھا سکتی ہے نہ رنگین لباس پہن سکتی ہے۔ مصنف نے اس افسانے میں بوڑھے دادا کے ذریعے سماج کے اس روّیے کی مخالفت کی ہے تاکہ بیوہ عورت کو سماج میں بہتر مقام حاصل ہو سکے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ بھولا گیتا شوق سے کیوں سنتا تھا؟

2۔ دوپہر میں کہانی سننے کے باوجود بھولا کے چہرے پر خوشی کیوں نہیں نظر آ رہی تھی؟

3۔ ''عورت کا دل محبت کا سمندر ہوتا ہے۔'' مصنف نے یہ بات کیوں کہی ہے؟

4۔ بھولا کہاں چلا گیا تھا اور کیوں؟

عملی کام:

- بھولا کی واپسی کے منظر کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
- اس سبق میں کچھ محاورے آئے ہیں جیسے نام روشن کرنا، آپ بھی ایسے چند محاورے تلاش کر کے لکھیے۔
- افسانے میں کچھ ہندی کے الفاظ آئے ہیں انھیں لکھیے۔
- افسانے کے آغاز میں راکھی باندھنے کا ذکر آیا ہے۔ اس تہوار کا کیا نام ہے اور اسے کیسے منایا جاتا ہے، اس پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

© NCERT not to be republished

سعادت حسن منٹو

(1912 – 1955)

منٹو ضلع لدھیانہ، پنجاب میں پیدا ہوئے۔ان کے خاندان کا تعلق کشمیر سے تھا۔منٹو کی ابتدائی تعلیم امرتسر میں ہوئی۔اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ آئے۔اسی دوران تعلیم منقطع کر کے ملازمت کر لی۔منٹو ابتدا میں روسی ادب سے متاثر ہوئے اور کئی روسی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ترقی پسند تحریک کے آغاز میں وہ اس تحریک سے متاثر ہوئے۔لیکن آگے چل کر وہ اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ابتدا میں اخبار ''مساوات'' (امرتسر) سے وابستہ رہے پھر ہفت روزہ ''مصوّر'' (بمبئی) میں مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔آل انڈیا ریڈیو سے بھی منسلک رہے۔کچھ عرصہ فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے۔کئی فلموں کے لیے کہانیوں کے ساتھ مکالمے اور اسکرین پلے بھی لکھے۔ملک کی آزادی کے بعد 1948 میں وہ مستقل طور پر لاہور چلے گئے۔

''تماشا'' منٹو کا پہلا افسانہ تھا جو انھوں نے جلیاں والا باغ کے سانحے سے متاثر ہو کر لکھا۔منٹو نے افسانہ نگاری میں موضوع اور ہیئت کے کئی ایسے تجربے کیے جو ان سے پہلے افسانہ نگاروں کے یہاں نظر نہیں آتے۔منٹو کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی حقیقت نگاری ہے۔''نیا قانون''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے علاوہ ''سیاہ حاشیے'' کے مختصر افسانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ منٹو نے سیاسی مسائل اور موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔افسانوں کے علاوہ منٹو نے ڈرامے، خاکے، ادبی اور فکاہیہ مضامین تحریر کیے اور ایک ناول ''بلاعنوان'' بھی شائع ہوا۔

''چُغد''، ''سیاہ حاشیے''، ''شکاری عورتیں''، ''پھندنے''، ''سرکنڈوں کے پیچھے''، ''یزید''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''سڑک کے کنارے''، ''دھواں''، ''لذتِ سنگ''، ''خالی بوتلیں خالی ڈبے''، ''نمرود کی خدائی'' وغیرہ ان کے افسانوں کے قابلِ ذکر مجموعے ہیں۔

© NCERT not to be republished

5012CH02

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈّے میں بہت عقلمند سمجھا جاتا تھا گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منھ بھی نہیں دیکھا تھا۔لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔اڈّے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہورہا ہے استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیشین گوئی کی تھی۔ ”دیکھ لینا چودھری،تھوڑے ہی دنوں میں اسپین میں جنگ چھڑ جائے گی۔“

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا۔ ”ولایت میں اور کہاں؟“ اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے،دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کررہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کررہا تھا۔

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکّہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتّا ہے۔اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی۔نہ معلوم کیوں وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے کو دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلّی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہوجاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدّر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتا یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہتا تھا۔” آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک

© NCERT not to be republished

ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کررکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔ اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

''شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی جیسے کوڑھ ہو رہا ہے۔ بالکل مردار، ایک دھپے کی مار اور گِٹ پِٹ گِٹ پِٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملاعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے۔'' یہ کہتے کہتے تھوڑی دیر کے لیے وہ خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بُڑبُڑانے لگ جاتا۔

''قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آ جائے۔''

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اس کو پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین نافذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

وہ مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے بارے میں آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ''سنا ہے پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟''

''ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا۔ اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔''

''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟''

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا۔ ''چل بیٹا، ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔''

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منھ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا۔ ''ہت تیری ایسی کی تیسی۔''

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلاف معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا، آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔ بہت بڑی خبر اور اس خبر کو اپنے اندر سے

© NCERT not to be republished

باہر نکالنے کے لیے وہ سخت بے چین تھا۔لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے دلی کی حالت میں ٹہلتا رہا۔اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آرہے تھے۔نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کھڑا کر دیا تھا۔وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا،اپنے دماغ کی تمام بتّیاں روشن کر کے غوروفکر کر رہا تھا۔اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ ''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا ؟'' بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔

وہ بے حد مسرور تھا۔خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ،سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہوجائیں گی۔

جب نتھو گنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا۔''لا ہاتھ ادھر.........ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہوجائے۔تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔''

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا ''تو دیکھتا رہ کیا بنتا ہے،یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔''

استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں،اسی لیے اس نے ''روس والے بادشاہ'' کو ''انڈیا ایکٹ''یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں پیدا ہونے والی تھیں وہ انھیں ''روس والے بادشاہ'' کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں ''روس والے بادشاہ''اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔اس کے علاوہ جب کبھی کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

© NCERT not to be republished

''جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریے کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں۔''

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی چوں کہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چناں چہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا ''ٹوڈی بچے!''

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں ''ٹوڈی بچہ'' کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور ''ٹوڈی بچے'' میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مُزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا۔

''نئے آئین نے میری امیدیں اور بڑھا دی ہیں۔ اگر....... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔''

''ویسے بھی بہت سی جگہیں نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔''

''وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔''

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی ''چیز'' سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ ''نیا قانون۔!'' اور وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ ''یعنی کوئی نئی چیز!'' اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدابخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا جگہ جگہ لوہے کی نِکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی ''نئے قانون'' کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو

© NCERT not to be republished

یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخرکار مارچ کے اکتیس دن ختم ہوگئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی۔وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا۔مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی۔آسمان کی طرح پرانی۔اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں 31/مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے،دکان کے بورڈ،اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگرو کی جھنجھناہٹ،بازار میں چلتے پھرتے آدمی.......ان میں سے کون سی چیز نئی تھی،ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں۔لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

''ابھی بہت سویرا ہے۔دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں''،اس خیال سے اسے تسکین تھی۔اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔''ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟''

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے پر پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے۔مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انار کلی میں تھا۔بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظّارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

......استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔اس کی بیوی گنگاوتی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی۔

© NCERT not to be republished

''ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔''

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ٹھیک اسی طرح جیسے گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہوتو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی ہے اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا۔

''چلو یہ بھی اچھا ہوا۔شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔''

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا۔ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے، گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی، جس طرح گھوڑا آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا۔ اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک ''گورا'' کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں

© NCERT not to be republished

دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہوگئے۔

پہلے اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیے ہیں ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔''

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا۔اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا۔

''صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟''

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ،ایک لرزش کے ساتھ گہری ہوگئی۔گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی۔اس کا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس ''گورے'' کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب ''گورے'' نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا،مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔اور ایسا معلوم ہوا کہ ایک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اُڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مَرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا۔'' جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا۔''

''وہی ہے۔'' یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے۔اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

''وہی ہے۔''اس نے یہ الفاظ اپنے منھ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہوگیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔اسے طوعاً وکرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے

پرزے اُڑادیے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہوگیا تھا۔اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا۔'' کہاں جانا مانگٹا ہے؟''

استاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا۔'' ہیرا منڈی۔''

'' کرایہ پانچ روپیہ ہوگا۔'' استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہوگیا۔وہ چلایا۔'' پانچ روپے؟ کیا تم .....''

'' پانچ روپے۔'' یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کرگیا۔'' کیوں جاتے ہو۔یا بے کار باتیں بناؤ گے؟''

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی کو نظر انداز کرچکا تھا۔وہ خیال کررہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پستہ قد گورے کو دیکھا۔گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے گرا کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کردیا۔

ششدر و متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کردیا جو گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا۔

'' پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں .... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔اب ہمارا راج ہے بچّہ!''

لوگ جمع ہوگئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔استاد منگو ان دو

© NCERT not to be republished

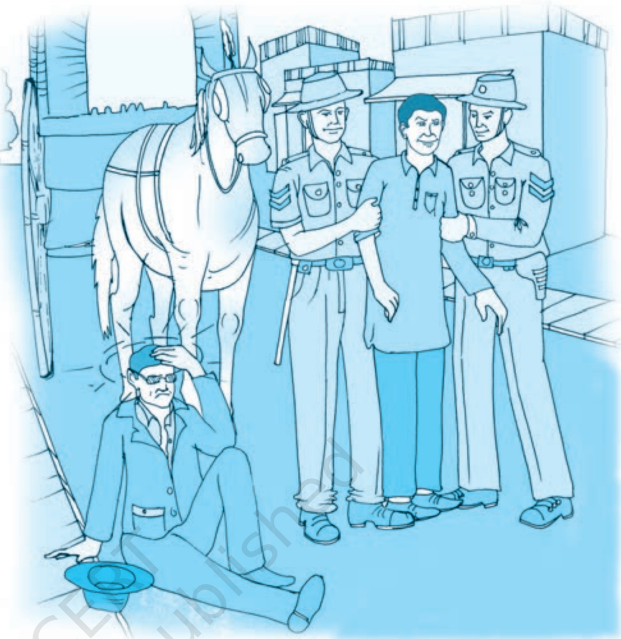

سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہورہی تھی۔منھ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔اب نیا قانون ہے میاں۔ نیا قانون!''

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ ''نیا قانون، نیا قانون'' چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

''نیا قانون، نیا قانون۔کیا بک رہے ہو۔قانون وہی ہے پرانا!''

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

—— سعادت حسن منٹو

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

مدبرانہ	:	سمجھداری سے بھرا ہوا
متانت	:	سنجیدگی، بردباری
حلقہ	:	گھیرا، دائرہ
تبادلۂ خیال	:	باہم گفتگو، آپس میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا
تنفّر	:	نفرت کرنا
مکدّر	:	بے کیف، بے مزا
ملاعون	:	اصل لفظ ''ملعون''، یعنی جس پر لعنت بھیجی جائے
ہتک	:	بے عزتی
جدید آئین	:	نیا قانون، نیا دستور
دیوانی مقدمہ	:	زمین یا جائداد کا مقدمہ
پیش خیمہ	:	کسی کام کے شروع ہونے سے پہلے ہونے والی بات یا واقعہ
ٹوڈی بچہ	:	انگریزی حکومت کا خوشامدی
درخشاں	:	چمکتا ہوا
تاباں	:	روشن، چمک دار
رعونت	:	تکبر، غرور
خوش پوش	:	خوش لباس، اچھے کپڑے پہننے والا
متجسس	:	جستجو کرنے والا، تلاش کرنے والا
خیرہ کن	:	جس سے آنکھیں چکاچوند ہو جائیں
غیر مرئی	:	جسے دیکھا نہ جا سکے

© NCERT not to be republished

طوعاً و کرہاً	:	مجبوراً، چار و ناچار
چشم زدن میں	:	پلک جھپکتے ہی
ششدر	:	حیرت زدہ، حیران

غور کرنے کی بات:

- افسانہ ’’ نیا قانون‘‘ کا مرکزی کردار منگو کوچوان ہے۔ منگو کوچوان کے ذریعے منٹو نے ایک سیدھے سادے ان پڑھ تانگے والے کی سمجھ کو خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔
- یہ افسانہ اس دور میں لکھا گیا جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ انگریزوں کی یہ حکومت منگو کوچوان کو بہت کھلتی تھی۔ وہ انگریزوں سے نفرت کرتا تھا اور اپنے ملک کو آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔
- اس افسانے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی سے پہلے ہندوستانی عوام میں انگریزوں کے خلاف غم و غصہ تھا۔ انگریزوں نے نہ صرف حکومت کی بلکہ ہندوستانی عوام پر بہت ظلم بھی ڈھائے اور انھیں بے عزت بھی کیا۔

© NCERT not to be republished

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ استاد منگو کون تھا اور اسے دنیا کے حالات کی خبریں کس طرح ملا کرتی تھیں؟

2۔ منگو کوچوان انگریزوں سے کیوں نفرت کرتا تھا؟

3۔ ’’ نیا قانون‘‘ کے آنے کی خبر سے منگو کوچوان کیوں خوش تھا؟

عملی کام:

- منگو کا کردار اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
- ذیل کے الفاظ کے متضاد لکھیے۔

جنگ جدید سست سرور گمان

- نیچے لکھے محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

ہوا سے باتیں کرنا، خون کھولنا، جان میں جان آنا، نزلہ گرنا

حیات اللہ انصاری

(1911 – 1999)

حیات اللہ انصاری لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔1926 میں مدرسہ فرنگی محل سے مشرقی علوم کی سند حاصل کی۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے۔کیا۔طالب علمی کے دوران ہی قومی تحریکوں میں دل چسپی پیدا ہوگئی تھی۔مہاتما گاندھی سے عقیدت کی بنا پر وہ کانگریس میں شامل ہوئے اور آخر وقت تک کانگریسی رہے۔1937 میں ہفتہ وار اخبار 'ہندوستان' جاری کیا۔1944 میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے لکھنؤ سے روزنامہ ''قومی آواز'' جاری کیا اور انصاری صاحب اس کے پہلے مدیر مقرر ہوئے۔1966 اور 1982 میں راجیہ سبھا کے رکن رہے۔ حیات اللہ انصاری اور ان کی اہلیہ نے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ ایک دستخطی مہم چلائی تھی۔

حیات اللہ انصاری نے افسانے، ناولٹ اور ناولوں کے ساتھ ساتھ تنقیدی مضامین بھی لکھے اور غیر اردو داں حضرات کو اردو سکھانے کے لیے ایک قاعدہ ''دس دن میں اردو'' لکھا۔1952 میں لکھنؤ میں تعلیم بالغان کے لیے تعلیم گھر قائم کیا۔ حیات اللہ انصاری نے پریم چند کے افسانوں سے متاثر ہوکر افسانے لکھے لیکن ان کے افسانوں کی فضا مختلف ہے۔ان افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں مشاہدہ، تخیل اور فکر تینوں ایک دوسرے کے متوازی ہیں۔ان کے افسانے زندگی کے تمام پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' 1939 میں شائع ہوا۔اس کے بعد ''بھرے بازار میں''، ''شکستہ کنگورے'' اور ''ٹھکانا'' کے عنوان سے ان کے افسانوی مجموعے، دو ناولٹ ''مدار'' اور ''گھروندا'' منظر عام پر آئے۔پانچ جلدوں پر مشتمل ضخیم ناول ''لہو کے پھول'' چھپا۔ ''جدیدیت کی سیر'' حیات اللہ انصاری کی تنقیدی کتاب ہے۔انھوں نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھیں جو ''میاں خوخو'' اور ''کالا دیو'' کے نام سے شائع ہوچکی ہیں۔

© NCERT not to be republished

5012CH03

بھیک

کیلاش کی لاری پتھورا گڑھ کے خشک بنجر اور تپتے ہوئے پہاڑوں کے ایک درے سے پار کر کے موتی نگر کی وادی میں داخل ہوئی اور داخل ہوتے ہی منظر اور موسم اور مسافروں کا مزاج سب کچھ بدل گیا۔ سامنے ایک طرف نندا دیوی اور ترشول کی برف پوش چوٹیاں چمک رہی تھیں اور دوسری طرف ڈھلواں پہاڑوں پر سیب، ناشپاتی اور آلوچوں کے باغوں کی ہریالی تھی جو پہاڑوں کے سلسلوں سے زینہ بزینہ اُترتی ہوئی نیچے جا کر گھنے درختوں اور نامعلوم تاریکیوں میں گم ہو جاتی تھی۔

جب لاری اسٹینڈ پر پہنچی کیلاش اپنی بہنوں سمیت اترا تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آج کوئی بہت بڑا تہوار ہے جسے پہاڑ اور ان کی چوٹیاں، درخت اور چڑیاں آسمان اور سورج یہ سب کے سب انسانوں کے ساتھ مل جل کر منا رہے ہیں۔ اس خوش گوار منظر میں کیلاش ایسا کھویا کہ اسے اپنی سخت بیماری کی وجہ سے زندگی کی طرف سے جو مایوسی تھی وہ بالکل دور ہو گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے آسمان کو چومنے والے پہاڑ اشاروں میں کہہ رہے ہیں کہ ہماری شاندار، صاف و شفاف اور دل کش دنیا میں بیماری اور مصیبتوں کا کیا کام۔ لاری اسٹینڈ سے ایک سڑک پر بل کھاتی ہوئی جھومتی جھامتی آبادی کی طرف جاتی تھی۔ اس نے کیلاش کو ایسا لبھایا کہ وہ نوکر سے جو اسباب کو اٹھوانے میں لگا ہوا تھا یہ کہہ کر کہ میں ڈاک بنگلے کی طرف چلتا ہوں، روانہ ہو گیا۔ راستہ بہت دل کش تھا اور ہر موڑ قدرت کی نت نئی فیاضیوں سے مالا مال تھا۔

کچھ دور نکل کر کیلاش ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ایک پیالی چائے پی، کچھ دیر سامنے کے منظر سے لطف اٹھایا اور پھر آگے کی طرف چل کھڑا ہوا۔ راستے میں ایک باغ میں ایک آدمی تازے سیبوں کو چیڑ کے بکس میں بند کر رہا تھا۔ اس کے پاس دو مسافر کھڑے تھے جن میں ایک دس گیارہ برس کی خوب صورت سی لڑکی تھی۔ وہ دونوں پھل والے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

کیلاش ادھر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں پاس سے ایک آواز آئی۔ ''بابو جی۔ تھرماس میں لے چلوں؟'' کیلاش نے مڑ کر دیکھا۔ بارہ تیرہ برس کی دبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی اور بڑی بڑی، مظلوم اور مایوس آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

تھرماس واقعی کیلاش کو بھاری معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے وہ لڑکی کے حوالے کر دیا اور پھر اس فیاضی سے جو قدرت نے اس وادی کے ساتھ دکھلائی تھی پوچھنے لگا۔

© NCERT not to be republished

''کہاں رہتی ہو؟''

لڑکی نے نیچے کی گھنی تاریکیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''وہاں بہت نیچے۔''

''ماں باپ کیا کرتے ہیں؟''

''مر گئے۔''

''تم کیا کرتی ہو؟''

''کچھ نہیں۔''

''کیوں؟''

''بچہ کچھ نہیں کرنے دیتا۔''

''بچہ؟ کیا تمھارا بچہ بھی ہے؟''

لڑکی اس بدگمانی پر ہنس پڑی اور کہنے لگی۔

''میرا دو برس کا بھائی ہے جو بہت دِق کرتا ہے۔ ہر وقت کھانا مانگتا ہے— رات کو نہ وہ سونے دیتا ہے اور نہ ڈر —''

ڈر!! اس وادی میں کس چیز سے؟''

''میری کٹھریا کا دروازہ ٹوٹا ہوا ہے۔ رات بھر میں ڈرتی رہتی ہوں کہ کوئی آ کر ہم کو کھا نہ جائے۔''

کیلاش کے دل میں دَیا اُبل پڑی۔

''نوکری کرے گی؟''

''کوئی رکھے تو کیوں نہ کروں۔ میں تو بہت محنت سے اس کی سیوا کروں گی۔''

''اچھا میں رکھوں گا تجھے بھی اور تیرے چھوٹے بھائی کو بھی۔''

لڑکی حیرت زدہ ہو کر کیلاش کو دیکھنے لگی۔

''بابو جی— سچ!''

''ہاں سچ— بالکل سچ۔''

لڑکی تھوڑی دیر تک حیرت زدہ رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ کیلاش کے پاؤں پر گر پڑی۔ اور شکر گزاری سے

© NCERT not to be republished

بابو جی بابو جی کرنے لگی۔ اس کے منھ سے اور کچھ نہ نکلا۔

رجنی خوشی کے مارے رات کو سو نہ سکی۔ ذرا ذرا دیر کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی تھی اور ہر بار وہ کروٹ لے کر ٹوٹے کواڑوں کی درزوں سے جھانکتی تھی کہ پہاڑوں کے اوپر آسمان پر صبح کی سفیدی تو نہیں نظر آ رہی۔ آج اس کا روزانہ والا خوف کہ کہیں رات کو کوئی بھیانک شکل والی چیز اس کی کوٹھڑی کے ٹوٹے پھوٹے دروازے سے گھس کر اس کو اس کے سب بھائی بہنوں کو سوتے میں کھا نہ جائے دور پہاڑوں میں چھپ گیا تھا۔ اس کے سامنے سکھ سے بھری ہوئی صبح تھی اور پھر عیش و آرام سے بھرے ہوئے دن اور رات۔

رجنی نے اپنے پانچوں بھائی بہنوں پر نظر ڈالی۔ جو کمبلوں کے گودڑ کے نیچے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے بے خبر سو رہے تھے۔ رجنی سوچ رہی تھی کہ ذرا دیر میں صبح ہو جائے گی۔ اور پھر اپنے بھائی بہنوں کو لے کر پانچ سوفٹ کی چڑھائی چڑھ کر بابو جی کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ پھر کیا؟ روٹیاں ملیں گی، پہننے کو بھی ملے گا اور رات کو اوڑھنے کو بھی اور ڈر سے بہت دور کسی کوٹھری میں سونے کو جگہ ملے گی۔

آخر صبح قریب آ ہی گئی اور اس کے دو سال کے دبلے پتلے سوکھے سا کھے بھائی للّو نے چیخ مار کر رونا شروع کر دیا۔ آج رجنی نے سستی نہیں دکھلائی اور جلدی سے اسے پیشاب کرا لیا۔ ورنہ ہوتا تو یہ تھا کہ وہ یوں ہی دن چڑھے تک پڑا رہتا تھا اور پھر جب اس کا بستر رجنی کو بھیگا ہوا ملتا تھا تو وہ للّو کو دھنک کر رکھ دیتی تھی۔ آج رجنی نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اسے پیشاب کرا لیا بلکہ اسے پیار بھی کیا اور بہلایا بھی۔ یہ چیز للّو کے لیے کچھ اتنی عجیب سی خوشی لے کر آئی کہ وہ رات بھر کی بھوک کو بھول گیا۔ اور اپنی ٹوٹی پھوٹی بولی میں باتیں کرنے لگا۔

جس وقت موتی نگر کی پچھّم کی چوٹیوں پر دھوپ کی پہلی چمک نظر آئی ہے، اس وقت تک چھ بچوں کا یہ قافلہ سوفٹ پہاڑ پر چڑھ چکا تھا۔ اور بہت تھک چکا تھا۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ تیز تھی اور مخالف تھی اس وجہ سے بچوں کو خالی پیٹ اوپر چڑھنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ للّو کئی مرتبہ رو چکا تھا اور رجنی کے ہاتھ سے اس پر پٹ بھی چکا تھا۔ رجنی نے ذرا دیر اسے گود میں بھی لیا تھا لیکن بارہ برس کی لڑکی جسے پیٹ بھر کھانا نہ ملتا ہو کیسے دو سال کے بچے کو لے کر دور تک جا سکتی تھی اس لیے للّو چل سکے یا نہ چل سکے اسے چلنا تو پڑے گا ورنہ رجنی مار مار کر راستے ہی میں ختم کر دے گی۔ اس وقت تو وہ کچلی ہوئی ناگن کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ اسے سخت کوفت تھی کہ یہ دو سال کا ہڈیوں کا ڈھانچہ، میں جہاں جاؤں یا جو کام کروں میری راہ میں حائل رہتا ہے۔ اب دیکھو اس وقت عیش و آرام کی دنیا صرف چار سوفٹ اوپر ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں کب کی وہاں پہنچ چکی ہوتی۔

رجنی کا غصہ دیکھ کر کلّو جو للّو سے دو سال بڑا تھا اور منّی جو چار سال بڑی تھی سہمے ہوئے تھے اور ہانپ ہانپ کر ایک ایک قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ البتہ تلسی اور رامو رجنی کی طرح تازہ دم تھے بلکہ ان دونوں نے بھی للّو کو باری باری گود میں ذرا ذرا دیر کے لیے اٹھا لیا تھا۔

اس طرح چھوٹے چھوٹے انسانوں کا یہ چھوٹا قافلہ ڈانٹ اور مار، خوف اور آنسو، تھکاوٹ اور ہانپنے، امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ پچاس فٹ اوپر چڑھ گیا۔ اس جگہ رامو کو ایک چشمے کے پاس پڑا ہوا ایک داغی سیب مل گیا۔ لیکن وہ ابھی منھ تک نہیں لے جانے پایا تھا کہ رجنی نے جھپٹ کر اسے چھین لیا اور دانت سے اس کا ایک بڑا سا ٹکڑا کاٹ کر للّو کو دیا۔ اور پھر باقی کے دو ٹکڑے کر کے کلو اور منی کو۔

کلو اور منی سیب کا ٹکڑا کھا کر، چشمے کا پانی پی کر تازہ دم ہو گئے اور باتیں کرنے لگے۔

کلّو : ''اوپر پتا اور ماں ملیں گی۔''

منی : ''نہیں — الّو — وہ نہیں — وہ تو مر گئے۔''

© NCERT not to be republished

کلّو : ''جو مر جاتے ہیں کیا وہ اوپر بھی نہیں ملتے؟''

منی : '' (بہت سنجیدگی سے) '' وہ کہیں نہیں ملتے۔'' ہم لوگ ایک اور بابو جی کے پاس جارہے ہیں جو پتا جی کی طرح روٹی دیں گے۔ کپڑے دیں گے اور اوڑھنے کو دیں گے۔''

ان دونوں کی باتیں سن کر نہ جانے کیا ہوا کہ رجنی پگھل سی گئی۔ اس نے ان دونوں کو اور پھر للّو کو پیار کیا اور کہا کہ ''اب دھیرے دھیرے اٹھتے بیٹھتے چلیں گے۔ پھر ڈھارس دینے لگی کہ اوپر پہنچتے ہی بہت سی روٹیاں ملیں گی جن میں گیہوں کی بھی ہوں گی۔ گرم کُرتے اور پیجامے ملیں گے، چائے ملے گی، سیب ملیں گے، پھر بابو جی کے ساتھ ہم لوگ ان کے دیس چلے جائیں گے جہاں بہت آرام سے رہیں گے۔''

رجنی جس نے آج تک اس وادی کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا تھا، پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف دیکھنے لگی اور سوچنے لگی کہ اس پار کی دنیا کیسی ہوگی؟ مگر جیسی بھی ہو، وہاں روٹیاں ہوں گی، کرتے پیجامے ہوں گے اور ایسے گھر ہوں گے جن میں ڈر نہ لگتا ہوگا۔

رجنی اب اپنے قافلے کو لے کر مزے مزے اوپر چڑھنے لگی۔ جتنا جتنا اوپر چڑھتی جاتی، اس کی خوشی بڑھتی جاتی۔

رجنی کو معلوم تھا کہ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہاڑوں میں گھومنے والے دولت مند کسی پہاڑی مرد یا عورت کو رکھ کر اپنے ساتھ میدان میں لے جاتے ہیں جہاں نہ برف پڑتی ہے نہ بھوک ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات دور دور اس کے تصور میں نہ تھی کہ میں بھی ان خوش نصیبوں میں ہوسکتی ہوں اور میرے ساتھ میرے پانچ بھائی بہن بھی۔

سورج اوپر چڑھ رہا تھا اور رجنی بھی اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ اوپر چڑھ رہی تھی۔ آخر ڈاک بنگلہ کی سرخ چھت نے اپنی جھلک دکھلا ہی دی۔

کیلاش چائے پی رہا تھا اور کھڑکی سے صاف ستھری نندا دیوی اور اس کے نیچے کے عظیم الشان پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے نوکر نے آ کر خبر دی ——

''کل والی لڑکی آئی ہے۔''

''اور اس کا بچہ بھی؟''

''ایک چھوڑ پانچ پانچ بچے ساتھ ہیں۔''

''پانچ پانچ۔''

© NCERT not to be republished

نوکر : ''جی حضور!''

کیلاش نے باہر آ کر دیکھا تو رجنی کھڑی تھی اور اس کے گرد بہت سے چھوٹے بڑے، میلے کچیلے، چیڑے چُند ھے بچے، ناک سے سُڑسُڑ کررہے تھے اور کیچڑ سے لت پت آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کیلاش نے رجنی کے پاس جا کر سختی سے جواب طلب کیا۔

''یہ سب کون ہیں؟''

رجنی کیلاش کو دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ اس نے اس کی سختی کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی اور چلا کر کہنے لگی۔

''میں ان سب کو لے آئی، اب یہ سب آپ کے پاس رہیں گے یہ منّی ہے، یہ للّو ہے، وہ رامو ہے، وہ کلّو ہے، وہ تلسی ہے۔''

کیلاش : ''سب تیرے بھائی ہیں؟''

رجنی : جی ہاں، دو بھائی ہیں اور دو بہنیں ہیں۔

رجنی ذرا صاف ستھری تھی اور اس کی صورت میں ایک کشش تھی لیکن بچے تو سڑی گلی چیزوں کا ڈھیر معلوم ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر کیلاش کا جی متلانے لگا۔ اور کل والی رومانی فیاضی جو رات گزر جانے سے باسی ہو چکی تھی حقیقت پسندی سے بدل گئی اور کیلاش سوچنے لگا کہ رجنی کے ساتھ ایک بچہ ہوتا دو ہوتے تو ممکن تھا، لیکن اتنوں کو کیسے پالا جاسکتا ہے؟ یہ سب ہمارے چھوٹے سے گھر میں کیسے رہیں گے، ان کو کھلایا اور پہنایا کہاں سے جائے گا؟ پھر یہ بہتی ہوئی ناکیں، یہ کیچڑ بھری آنکھیں، یہ کوئلہ ایسے ہاتھ پاؤں، یہ بوٗ اور میل!! کیلاش کی بہنیں بھی باہر نکل آئی تھیں کہ ہم بھی ذرا بھیّا کے مہمانوں کو دیکھیں۔

وہ بولیں : ''بھیا ان سب کو لے چلو گے؟''

کیلاش یہ سوال سن کر جھنجھلا گیا اور رجنی سے کہنے لگا۔

''تو نے کل کیوں نہیں بتلایا کہ تیرے ساتھ اتنی بڑی فوج ہے، سب کو میں کہاں رکھ سکتا ہوں؟''

یہ سن کر رجنی پر بجلی گر پڑی۔ اتنی بڑی مایوسی کا سامنا اس نے زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سوکھ گیا اور آنکھیں اندر ڈوب گئیں مگر منھ سے کچھ نہ نکل سکا۔ اس کے سب بھائی بہنوں کا بھی یہی حال ہوا۔ کلّو تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

رجنی نے اپنی گھنونی فوج کو نفرت بھری آنکھوں سے دیکھا۔ ایسی نفرت جس کا تقاضا یہ تھا کہ ان سب کو مار ڈالو یا خود مر جاؤ۔

پانچ منٹ کے اندر اندر یہ فوج ناکامی اور نامرادی کو اپنے پھٹے دامنوں میں لے کر پسپا ہوئی لیکن کیلاش کے لیے آسان نہ

© NCERT not to be republished

تھا کہ ان کو یوں رخصت کرتا۔اس کی دَیا جومرگئی تھی پھر کراہنے لگی اور پکارنے لگی کہ کچھ تو کرو۔اس پکار سے نجات پانے کے لیے کیلاش نے رجنی کو پکارا— اور دو روپیے اس کے ہاتھ میں رکھ دیے۔

دو روپیے — اس سے بہت کچھ خریدا جاسکتا ہے، رجنی اپنی فوج کو لے کر بازار کی طرف بھاگی اور ایک دوکان کے سامنے سب کو پوریاں کھانے اور کھلانے لگی۔ پہلے آٹھ آنے کی پوریاں لیں، پھر آٹھ آنے کی اور لیں، پھر چار آنے کی اور لیں، پھر اور چار آنے کی۔ اس طرح دونوں روپیے ختم ہوگئے۔لیکن نہ بھوک گئی اور نہ کھانے کی حسرت۔

دوپہر کے بعد یہ قافلہ خالی ہاتھ نیچے کی طرف تھکے دل اور تھکے پاؤں کے ساتھ اُترنے لگا اور اس طرح کہ بیٹھ گیا تو اٹھنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی۔صبح جن تاریکیوں سے نکل کے آیا تھا، شام کو ان ہی کی طرف جارہا تھا۔سورج بھی ڈوبتا جارہا تھا اور وہ لوگ بھی اترتے جارہے تھے مگر بالکل خاموشی سے، نہ رونا، نہ ڈانٹنا، نہ اظہارِ حسرت، نہ ڈھارس گویا یہ سب بچے نہیں بوڑھے تھے، اور وہ بھی ہڈی چمڑے کے نہیں، گودڑ کے بنے ہوئے۔صرف للّو دو ایک بار رویا مگر رجنی کے مارنے نے اس کی بھی آواز بند کردی۔سورج ڈوبنے پر یہ لوگ اسی اپنی پرانی کوٹھری میں پہنچے جہاں بھوک تھی اور سردی تھی، خوف تھا اور ان تینوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

پہنچتے ہی تھکی ہوئی تلسی نے آہستہ سے کہا۔"بھوک لگی ہے۔" پھر رامو نے بھی کہا، پھر منی اور کلو نے بھی۔دل کی امیدوں کے ساتھ پیٹ کی پوریاں بھی غائب ہوچکی تھیں۔

رجنی بچوں کو اندھیرے اور بھوک اور ڈر کی آغوش میں چھوڑ کر پڑوسیوں کی دیا کا امتحان کرنے نکل کھڑی ہوئی۔

——— حیات اللہ انصاری

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

بنجر	:	وہ زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو
برف پوش چوٹیاں	:	برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں
دل کش	:	دل کو لبھانے والا

دِق کرنا	:	تنگ کرنا، پریشان کرنا
چشمہ	:	پانی کا سوتا
حسرت	:	کسی چیز کے نہ ملنے کا احساس
پسپا	:	شکست، ہار

غور کرنے کی بات:

- یہ افسانہ انسان کی بنیادی ضرورتوں یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کے مسائل کے گرد گھومتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ بھوک مٹانے کے لیے کتنی مصیبت اُٹھانی پڑتی ہے۔
- اس افسانے کے مرکزی کردار رجنی میں ہندوستانی عورت کی ممتا نظر آتی ہے۔ وہ اپنی فاقہ کشی اور مفلسی کے باوجود چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے ایثار اور قربانی کی مثال پیش کرتی ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ موتی نگر کی وادی میں داخل ہوتے ہی مسافروں کا مزاج کیوں بدل گیا؟
2۔ رجنی کو ایسی کون سی خوشی حاصل ہوئی جس کی وجہ سے وہ رات بھر سو نہ سکی؟
3۔ پہاڑ پر چڑھتے وقت رجنی اور اس کے بہن بھائیوں کے جذبات کیا تھے؟
4۔ کیلاش نے ایسا کیا کہا جسے سن کر رجنی پر بجلی سی گر پڑی؟

عملی کام:

- افسانے کا مرکزی خیال بتائیے۔
- اس افسانے میں ایک محاورہ استعمال ہوا ہے ''بجلی گرنا''۔ یہ محاورہ کس موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک یا دو جملوں میں استعمال کرکے واضح کیجیے۔
- اس افسانے کے آخری جملے کی وضاحت کیجیے۔

© NCERT not to be republished

سوانح

سوانح میں کسی ایک شخص کی زندگی کے واقعات اور حالات یا شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا بیان کیا جاتا ہے۔ سوانح نگار اپنے ہم عصروں کے سوانح بھی لکھ سکتا ہے اور تاریخی شخصیتوں کے سوانح بھی۔ اس صنف کا مقصد کسی اہم شخص کے حالات زندگی سے قاری کو روشناس کرانا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اس شخص کے ساتھ ساتھ اپنے ہم عصروں کا حال بھی لکھ سکتا ہے اور اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈال سکتا ہے۔ ہمارے یہاں مولانا حالؔی اور شبلؔی نعمانی نے سوانح نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔

حالؔی نے ممتاز ادبی شخصیتوں کے سوانح لکھے مثلاً حیات سعدؔی میں شیخ سعدؔی، یادگار غالب میں غالبؔ اور حیات جاوید میں سرسید کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

شبلؔی نعمانی نے سیرۃ النبیؐ، سیرۃ النعمان، الغزالی، المامون اور الفاروق جیسی سوانحی کتابیں لکھی ہیں۔ شبلؔی نے سوانح نگاری کے ذریعے اسلاف کی علمی ادبی اور مذہبی زندگی کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

© NCERT not to be republished

الطاف حسین حالؔی

(1837—1914)

مولانا الطاف حسین حالؔی پانی پت میں پیدا ہوئے۔علم کی طلب اور شعروسخن کا ذوق انھیں دہلی لایا۔ یہاں انھوں نے نواب مصطفٰی خاں شیفتؔہ اور مرزا غالبؔ جیسی شخصیتوں سے فیض حاصل کیا۔غالبؔ اور شیفتؔہ کے انتقال کے بعد حالؔی لاہور چلے گئے اور انگریزی حکومت کے ملازم ہوگئے۔لاہور میں محمد حسین آزؔاد کے ساتھ مل کر ڈاکٹر ڈبلیو۔جی۔لائٹنر اور دوسرے انگریز افسروں کے تعاون سے انھوں نے اردو میں جدید نظم کی بنیاد ڈالی۔اردو کے سوانحی ادب میں حالؔی کی ''حیاتِ سعدی'' 1886 میں، ''یادگارِ غالب'' 1897 میں اور ''حیاتِ جاوید'' 1901 میں شائع ہوئیں۔ان کی شاعری میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہے ۔ان کی طویل نظموں میں ''مدوجزرِ اسلام'' جو عام طور پر ''مسدس حالؔی'' کے نام سے مشہور ہے، اور ''مناجاتِ بیوہ'' اہم ہیں۔حالؔی کا ''مقدمہ شعروشاعری'' اردو تنقید میں ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے ۔انھوں نے شاعری کے اخلاقی اور اصلاحی پہلوؤں پر زور دیا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔حالؔی کا شمار سرسید کے خاص رفیقوں میں ہوتا ہے۔

'سرسید کا بچپن' مولانا حالی کی کتاب '' حیات جاوید'' سے ماخوذ ہے۔

© NCERT not to be republished

5012CH04

سرسیّد کا بچپن

سرسیّد کے خاندان کا حال جس قدر ہم نے لکھا ہے شاید ناظرین کتاب اس کو قدرے ضرورت سے زیادہ خیال کریں۔لیکن بائیوگرافی کا اصل مقصد جو ہیرو کے اخلاق وعادات وخیالات کا دنیا پر روشن کرنا ہے وہ اُس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک یہ نہ کہا جائے کہ ہیرو میں اخلاق وعادات اور خیالات کہاں سے آئے؟ اور اُن کی بنیاد اُس میں کیونکر پڑی؟ انسان میں کچھ خصلتیں جبلّی ہوتی ہیں جو آباواجداد سے بطورمیراث کے اُس کو پہنچتی ہیں۔اور زیادہ تر وہ اخلاق وعادات ہوتے ہیں جو بچپن میں نامعلوم طور پر وہ اپنے خاندان کی سوسائٹی سے اکتساب کرتا ہے اور جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ جاتے ہیں جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے لیکن آدمی اپنی جبلّت سے نہیں ٹل سکتا۔پس ہیرو کے خاندان کا حال جس میں وہ پیدا ہوا اور اُس سوسائٹی کا حال جس میں اس نے نشوونما پائی درحقیقت ہیرو کے اخلاق وعادات پر ایک ایسی روشنی ڈالتا ہے جس کے بعد کسی اور ثبوت کے پیش کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

سرسیّد کے پیدا ہونے سے پہلے ان کی بہن صفیۃ النسا اور ان کے بھائی سیّدمحمد خاں پیدا ہو چکے تھے۔سیّدمحمد خاں کے پیدا ہونے کی اُن کو نہایت خوشی ہوئی۔سرسیّد سے چند مہینے پہلے اُن کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام حاتم علی خاں تھا۔سرسیّد کو اوّل حاتم علی خاں کی والدہ نے دودھ پلایا اور پھر خود سرسیّد کی والدہ نے۔ وہ اپنے خاندان کے اکثر بچوں کی نسبت زیادہ قوی اور توانا اور ہاتھ پاؤں سے تندرست پیدا ہوئے تھے......

سرسیّد کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت جس سے اُن کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلف فوقیت دی جاسکے نہیں پائی جاتی تھی۔یعنی جیسے کہ بعضے بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طبّاع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں سرسیّد میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا۔معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غوروفکر سے بتدریج ترقی دی تھی اور اسی لیے ان کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ زیادہ چمکدار معلوم نہیں ہوتا۔لیکن جس قدر آگے بڑھتے جایئے اُسی قدر اس میں زیادہ عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ہیرو کو معمولی آدمیوں کی سطح سے بالاتر کردیتی ہے۔اسی لیے بعض حکما کی یہ رائے ہے کہ محنت سے آدمی

© NCERT not to be republished

جو چاہے سو ہوسکتا ہے۔

سرسیّد کو مسماۃ ماں بی بی نے جو ایک قدیم خیر خواہ خادمہ اُن کے گھرانے کی تھی، پالا تھا۔اس لیے ان کو ماں بی بی سے نہایت محبت تھی۔ وہ پانچ برس کے تھے جب ماں بی بی کا انتقال ہوا۔اُن کا بیان ہے کہ'' مجھے خوب یاد ہے ماں بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسے کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی۔ جب وہ مرگئی تو مجھے اُس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کی بہت آرام سے گزرتی ہے تم کچھ رنج مت کرو۔ مجھ کو ان کے کہنے سے پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اُس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا ماں بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔اس نے مرتے وقت کہا کہ میرا تمام زیور سیّد کا ہے، مگر میری والدہ اس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر تم کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیج دوں، میں نے کہا ہاں بھیج دو۔ والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح سے خیرات میں دے دیا۔''

بچپن میں سرسیّد پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ ان کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود ان کے ماموں ان کی خالہ اور دیگر نزدیکی رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے ان کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کودنے کے لیے کافی تھے۔اس لیے ان کو نوکروں اور اجلافوں کے بچوں اور اشرافوں کے آوارہ لڑکوں سے ملنے جُلنے اور ان کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ان کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمھارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔اس لیے سب لڑکے جو کھیل کھیلتے تھے اپنے بڑوں کے سامنے کھیلتے تھے۔ان کے کھیلوں میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کرسکیں۔ خواجہ فرید کی حویلی جس میں وہ اور ان کے ہم عمر لڑکے رہتے تھے اس کا چوک اور اس کی چھتیں ہر قسم کی بھاگ دوڑ کے کھیلوں کے لیے کافی تھیں۔ابتدا میں وہ اکثر گیند، بلاّ، کبڈی، گیڑیاں، آنکھ مچولی، چیل چِلو وغیرہ کھیلتے تھے۔اگر چہ گیڑیاں کھیلنے کو اشراف معیوب جانتے تھے مگر ان کے بزرگوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ آپس میں سب بھائی مل کر گیڑیاں بھی کھیلو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

ان کا بیان تھا کہ'' باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی، جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جدا حویلی بنائی اور وہاں آرہیں تو باوجود یہ کہ اس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی۔ جب کبھی میں اُن کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اسی لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔''

© NCERT not to be republished

سرسیّد لکھتے ہیں کہ ’’میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانے میں کھاتے تھے ۔ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھتا تھا۔ بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں سب ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے، بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے؟ جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لے کر اپنے ہاتھ سے اس کی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے ، ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے، اور نوالا چبانے کی آواز منہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا وہ باہر دیوان خانے میں کھاتے تھے۔ زنانہ ہو جاتا تھا، میری والدہ اور میری چھوٹی خالا کھانا کھلانے آتی تھیں۔ ہم سب لڑکے ان کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی۔ کسی کے پاؤں کا دھبّا سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔ روشنائی وغیرہ کا دھبّا کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا تو اس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد اُن کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں سے ایک میں بھی تھا، ان کو سبق سنانے جاتے تھے۔ جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے اور گھُڑک دیتے۔‘‘

گرمی اور برسات کے موسم میں اب بھی دلّی کے اکثر باشندے سہ پہر کو جمنا پر جا کر پانی کی سیر دیکھتے ہیں اور تیرنے والے تیرتے ہیں، مگر پچاس برس پہلے وہاں اشراف تیرنے والوں کے بہت دلچسپ جلسے ہوتے تھے۔ سرسیّد کہتے تھے کہ ’’میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلّی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا جن میں مرزا مغل اور مرزا اطفل بہت سر برآوردہ نامی تھے۔ اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سوسوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی بائیں تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے تو اس زمانے میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینت المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینت المساجد میں جمع ہو جاتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔‘‘

تیراندازی کی صحبتیں بھی سرسید کے ماموں زین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ ’’ مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیراندازی ہوتی تھی یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیراندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اس زمانے میں دریا کا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیراندازی شروع ہوتی تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خاں،

© NCERT not to be republished

نواب سیّدعظمت اللہ خاں، نواب ابراہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسہ میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروز پورجھرکہ جب دلّی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اسی زمانے میں تیراندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہوگئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جوتودے میں نہایت صفائی اورخوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا ''مچھلی کے جائے کوکون تیرنا سکھائے'' یہ جلسہ برسوں تک رہا پھر موقوف ہوگیا۔''

دلّی سے سات کوس مغل پور ایک جاٹوں کا گاؤں ہے۔ وہاں سرسیّد کے والد کی کچھ ملک بطور معافی کے تھی۔ اگر کبھی فصل کے موقع پر ان کے والد مغل پور جاتے تو ان کو بھی اکثر اپنے ساتھ لے جاتے اور ایک ہفتہ گاؤں میں رہتے۔ سرسیّد کہتے تھے کہ ''اس عمر میں گاؤں میں جا کر رہنا، جنگل میں پھرنا، عمدہ دودھ اور دہی اور تازہ تازہ گھی اور جاٹنیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت ہی مزہ دیتا تھا۔''

سرسیّد کے والد کو اکبرشاہ کے زمانہ میں ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا۔ مگر اخیر میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، انھوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو باوجود یہ کہ ان کی عمر کم تھی دلوانا شروع کر دیا تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اٹھ کر قلعے چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہر چند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہوکر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہوگئی۔ جب لال پردے کے قریب پہنچا تو قاعدے کے موافق اوّل دربار میں جا کر آداب بجالانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہن کر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا۔ جب خلعت پہن کر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا اور بادشاہ تخت پر سے اٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ والد سے جو اس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے کہا کہ '' تمھارا بیٹا ہے؟'' انھوں نے کہا ''حضور کا خانہ زاد'' بادشاہ چپکے ہو رہے۔ لوگوں نے جانا کہ بس اب محل میں چلے جائیں گے، مگر جب تسبیح خانے میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے۔ تسبیح خانے میں بھی ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے۔ اس چبوترے پر بیٹھ گئے، جواہر خانے کے داروغہ کو کشتیِ جواہر حاضر کرنے کا حکم ہوا، میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بُلایا اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ دیر کیوں کی؟ حاضرین نے کہا عرض کرو کہ تقصیر ہوئی۔ مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مسکرائے اور فرمایا بہت سویرے اُٹھا کرو۔ اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ لوگوں نے کہا آداب بجالاؤ۔ میں آداب بجالایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں۔ میں نے نذر دی اور بادشاہ اُٹھ کر خاصی ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے۔ تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔ سرسید کہتے تھے کہ

© NCERT not to be republished

''اس زمانے میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی۔ تقریباً انھیں دنوں میں راجہ رام موہن رائے جو برہمو سماج کے بانی تھے، ان کو اکبر شاہ نے کلکتہ سے بلایا تھا تا کہ اضافۂ پنشن بادشاہی کے لیے ان کو لندن بھیجا جائے۔ چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے اور 1831ء میں وہاں پہنچے۔'' سرسیّد نے لندن جانے سے پہلے ان کو متعدد دفعہ دربارشاہی میں دیکھا تھا۔

سرسید کہتے تھے کہ'' مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے۔ خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکّا بکّا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انھوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھالیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور اوّل بسم اللہ پڑھ کر اقراء کی اوّل آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا۔'' سرسید نے جب یہ ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لیے انھوں نے کبھی کہا تھا، پڑھا؎

به مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی
زفیضِ نقش بندِ وقت جانِ جان جانانی

© NCERT not to be republished

سرسیّد کہتے تھے کہ'' شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اُٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے۔ الا ماشاء اللہ۔ صرف میرے والد پر جو غایت درجہ کی شفقت تھی اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔ بسم اللہ ہونے کے بعد سرسید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ ان کی ننھیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی۔ سرسید نے استانی ہی سے جو ایک اشراف گھر کی پردہ نشین بی بی تھی، سارا قرآن ناظرہ پڑھا تھا۔ وہ کہتے تھے'' میرا قرآن ختم ہونے پر ہدیے کی مجلس جو زنانہ میں ہوئی تھی وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔'' قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے لگے۔ مولوی حمیدالدین ایک ذی علم اور بزرگ آدمی ان کے نانا کے ہاں نوکر تھے جنھوں نے ان کے ماموں کو پڑھایا تھا۔ اُن سے معمولی کتابیں کریما، خالق باری، آمد نامہ وغیرہ پڑھیں۔ جب مولوی حمیدالدین کا انتقال ہو گیا تو اور لوگ پڑھانے پر نوکر ہوتے رہے۔ اُنھوں نے فارسی میں گلستاں، بوستاں، اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی۔ مگر طالب علموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے ساتھ۔ اس کے بعد اُن کو اپنے خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا جس میں ان کی ننھیال کے لوگ دلّی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ماموں

نواب زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی درسی کتابیں، تحریر اقلیدس کے چند مقالے پڑھے۔ اُسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہوگیا۔ جب انھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعے کا برابر شوق رہا۔ اور دلّی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہباؔئی، غالبؔ، اور آزردہؔ وغیرہ ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ (تلخیص)

____ الطاف حسین حالؔی

مشق

لفظ و معنی:

ناظرین	:	ناظر کی جمع، دیکھنے والے
اکتساب	:	کسب کرنا، محنت کرکے حاصل کرنا
نشوونما	:	ترقی، بڑھوتری
ذکی	:	ذہین، تیز دماغ والا
طبّاع	:	جس کی طبیعت میں اُپج ہو
صریح امتیاز	:	فرق جو ظاہر ہو، کھلا ہوا فرق
قوا	:	قوتیں (یہاں صلاحیتیں مراد ہے)
فی الواقع	:	دراصل
اجلافوں	:	اجلاف، جُلف کی جمع، نچلے طبقے کے لوگ
اشرافوں	:	اشراف، شریف کی جمع، اعلا خاندان والے
سربرآوردہ	:	معزّز، ذمہ دار

© NCERT not to be republished

غول	:	بھیڑ، ہجوم، بہت سے لوگ
مِلکِ بطورمعافی	:	عطا کی ہوئی زمین کی ملکیت
مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے	:	یہ مشہور کہاوت ہے، اپنے آبائی کام سے ہر کوئی واقف ہوتا ہے۔
تقصیر	:	کوتاہی، قصور، غلطی
ہکّابکّا ہونا	:	حیران رہ جانا، حیرت زدہ
بسم اللہ	:	اس تقریب کا نام جس میں بچوں کو قرآن پڑھانےکی ابتدا کی جاتی ہے، اللہ کے نام سے شروع
اقرا سے مالم یعلم	:	قرآن مجید کی ''سورہ علق'' کی ابتدائی پانچ آیتیں قرآن مجید کی یہ آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئی تھیں
اِلّا ماشاء اللہ	:	مگر جو چاہا اللہ نے، مراد کبھی کبھی
غایت	:	غرض، مطلب
قرآن ناظرہ پڑھنا	:	ناظرہ، قرآن شریف دیکھ کر پڑھنا
سالِ جلوس	:	کسی بادشاہ کی تخت نشینی کا سال

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- حاؔلی نے بائیوگرافی کے تعلق سے لکھا ہے کہ اس کا اصل مقصد ''اس شخص کے اخلاق و عادات اور خیالات کو پیش کرنا'' ہے جس کی سوانح لکھی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ اس شخص کے خاندان کا حال جس میں وہ پیدا ہوا ہے اور اس معاشرے کا حال بھی جس میں اس نے نشوونما پائی ہو، درحقیقت یہ سب مل کر کسی بھی شخص کے اخلاق وعادات پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں جس کے بعد کسی اور ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے حاؔلی نے سرسیّد کی سوانح حیاتِ جاوید میں ان کے خاندان کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔
- اس سبق کے مطالعے سے ہم سرسیّد کے بچپن، ان کے احباب اور رشتے داروں سے متعارف ہونے کے علاوہ اس بات سے بھی واقف ہوجاتے ہیں کہ انھیں حصولِ علم کا شوق کس طرح دہلی کے اہلِ علم کی مجلسوں میں لے جایا کرتا تھا۔
- سبق میں لفظ سالِ جلوس آیا ہے۔ کوئی بادشاہ جس سال تخت نشین ہوا کرتا تھا اس سال کو اس کا سالِ جلوس کہتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے دورانِ بادشاہت جب کوئی واقعہ کسی وقت رونما ہوتا تھا تو اس واقعہ کا حوالہ اس کے بادشاہت کے اس سال سے دیا جاتا تھا۔

یعنی اگر کسی بادشاہ کے تخت نشین ہونے کے بارہ سال کے بعد کوئی واقعہ رونما ہوا ہے تو یہی کہا جاتا تھا کہ یہ واقعہ اس کے بارہویں سالِ جلوس میں رونما ہوا تھا۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ سرسیّد نے اپنا بچپن کیسے گذارا؟
2۔ سرسیّد کے نانا کے یہاں دسترخوان کے آداب کیا تھے؟
3۔ سرسیّد نے بچپن میں کون کون سے کھیل کھیلے؟
4۔ سرسیّد کو گاؤں میں جا کر رہنا کیوں پسند تھا؟

عملی کام:

- ماں بی بی اور سرسید کے تعلق کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
- اس مضمون میں جن کتابوں کے نام آئے ہیں انھیں اپنی کاپی میں لکھیے۔

© NCERT not to be republished

ڈراما

ڈراما یونانی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں 'کرنا' یا کرکے دکھانا'۔ ادب میں یہ ایسی صنف ہے جس میں کرداروں، مکالموں اور مناظر کے ذریعے کسی کہانی کو پیش کیا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستان میں سنسکرت کاویہ میں بھی اس کی روایت بہت مضبوط تھی اور اس کو ''ناٹیہ'' کہا جاتا تھا۔

ارسطو نے ڈرامے کو زندگی کی نقالی کہا ہے۔ داستان، ناول اور افسانے کے مقابلے میں ڈراما اس لحاظ سے حقیقت سے قریب تر ہوتا ہے کہ اس میں الفاظ کے ساتھ ساتھ کردار، اُن کی بول چال اور زندگی کے مناظر بھی دیکھنے والوں کے سامنے آتے ہیں۔ کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کو مکالمے اور آواز کے اُتار چڑھاؤ کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ ڈراما بنیادی طور پر اسٹیج کی چیز ہے، لیکن ایسے بھی ڈرامے لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے ہیں جو صرف سُنانے اور پڑھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ریڈیو کی وجہ سے ڈراموں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اور ٹیلی وژن پر جس طرح کے سیریل سب سے زیادہ پیش کیے جاتے ہیں، اُن کا تعلق کسی نہ کسی طرح ڈرامے ہی کی صنف سے ہوتا ہے۔

ارسطو نے ڈرامے کے اجزائے ترکیبی میں چھے چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ قصّہ، کردار، مکالمہ، خیال، آرائش اور موسیقی۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر ڈرامے میں سنگیت یا موسیقی کا عنصر ہو۔ پلاٹ، کردار، مکالموں اور مرکزی خیال کا ہونا البتہ ضروری ہے۔ ڈرامے کی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں واقعات کی کڑیاں اس طرح ملائی جائیں کہ بتدریج نقطۂ عروج تک پہنچ سکیں اور ناظرین کی توجہ ایک نکتے یا خیال پر مرکوز ہو جائے۔ اس کے بعد ڈراما انجام کی طرف بڑھتا ہے۔ واقعات سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، وہ انجام کے ذریعے پیش کر دیا جاتا ہے۔ حق و باطل اور خیر و شر کی کش مکش، بنیادی انسانی اقدار اور سماجی، قومی و سیاسی مسائل کو ڈراموں میں پیش کیا جاتا ہے۔

اردو میں ڈرامے کا آغاز واجد علی شاہ کے زمانے میں ہوا جب ''رادھا کنھیا'' کا قصّہ اسٹیج کیا جانے لگا۔ امانت کی ''اندرسبھا'' بھی اسی زمانے میں لکھی گئی جو بے حد مقبول ہوئی۔ ''اندرسبھا'' کے اثر سے بعد کے پارسی اردو تھیٹر میں بھی رقص و موسیقی کا

© NCERT not to be republished

خاصا زور رہا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں اردو تھیٹر نے بہت ترقی کی اور آغا حشر کے ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ اس کے بعد امتیاز علی تاج، حکیم احمد شجاع، ڈاکٹر سیّد عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، مرزا ادیب، اشتیاق حسین قریشی اور فضل الرحمٰن نے ڈراما نگاری پر خصوصی توجہ کی۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور ریوتی سرن شرما نے بھی ریڈیائی ڈرامے لکھے اور ڈراما نگاری کی روایت کو مزید استحکام بخشا۔

© NCERT not to be republished

محمد مجیب

(1902 – 1985)

محمد مجیب لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک معروف وکیل تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے لوریٹو کانونٹ میں حاصل کی۔ اس کے بعد دہرہ دون کے ایک پرائیوٹ اسکول سے سینیر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ 1919 میں محمد مجیب نے آکسفورڈ سے جدید تاریخ میں بی۔اے (آنرز) کیا۔ برلن میں اُن کی ملاقات ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر سیّد عابد حسین سے ہوئی۔ وہیں انھوں نے جرمن اور روسی زبانیں سیکھیں۔ فرانسیسی زبان وہ آکسفورڈ میں سیکھ چکے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ انھوں نے جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں کام کرنے کا عہد کیا۔ فروری 1926 میں وہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) بنائے گئے اور وہ اس عہدے پر چوبیس برس تک فائز رہے۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

مجیب صاحب انتظامی امور کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں بھی برابر لگے رہے۔ اردو اور انگریزی میں ان کی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔ مجیب صاحب نے آٹھ ڈرامے لکھے جن کے نام ہیں: ''کھیتی''، ''انجام''، ''خانہ جنگی''، ''حبّہ خاتون''، ''ہیروئن کی تلاش''، ''آزمائش'' اور ''دوسری شام''، اور بچوں کے لیے ایک ڈراما ''آؤ ڈراما کریں''۔ مجیب صاحب صاف، سادہ اور سلیس نثر لکھتے تھے۔ ان کے مکالموں میں بول چال کا فطری انداز ہے۔

نصاب میں جو ڈرامہ شامل ہے وہ مجیب صاحب کے ڈرامے ''آزمائش'' کا آخری ایکٹ ہے۔ یہ ڈراما 1857 کے الم ناک تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ جنرل بخت خاں اور اس کی ہندوستانی فوجوں کو شکست ہو چکی ہے۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہو جانے کے بعد پکڑ دھکڑ شروع ہو چکی ہے۔ رام سہائے کی بیوی بھاگ وتی نے جنگِ آزادی کی دو مجاہد خواتین سلمیٰ اور کشن کنور کو پناہ دے رکھی ہے۔ بخت خاں کے سپاہی اگرچہ ہار گئے ہیں لیکن ان کے حوصلے بلند ہیں۔

© NCERT not to be republished

5012CH05

آزمائش

(آخری ایکٹ)

رام سہائے مل کے مکان میں ایک چھوٹا سا دالان۔ رات ہوگئی ہے۔ ڈیوَٹ پر ایک دیا جل رہا ہے۔ رام سہائے مل اس کی روشنی میں کھانا کھا رہا ہے۔ بھاگ وتی، اس کی بیوی، آنچل سے منھ بند کیے کھڑی ہے، اُس کو پنکھا جھل رہی ہے اور چُپکے چُپکے رو رہی ہے۔ رام سہائے مل کو اس کے رونے کا احساس نہیں ہے اور وہ کھانا کھاتا رہتا ہے۔

رام سہائے مل : کہو، آج پانی کافی مِل گیا؟

بھاگ وتی : (رُوہانسی آواز میں) ابھی شام کو رام پرشاد لے آیا۔ بہت دور جانا پڑا، آس پاس کے کنوؤں میں لاشیں پڑی ہیں۔

رام سہائے مل : رام رام، رام رام۔۔۔(اس کی طرف دیکھ کر) مگر تم رو کیوں رہی ہو؟

بھاگ وتی : میرا بھی مرجانے کو جی چاہتا ہے۔

رام سہائے مل : کیوں، تم کیوں بیٹھے بیٹھے جان سے بیزار ہوگئی ہو؟

بھاگ وتی : کیا بتاؤں؟

رام سہائے مل : پرماتما کا شکر کرو۔ اتنی بڑی مصیبت آئی اور گزر گئی۔

بھاگ وتی : ہاں۔

رام سہائے مل : مگر ابھی بہت چوکس رہنا ہے۔ دیکھتی رہنا دروازے سے پہرے والے نہ ہٹیں۔

بھاگ وتی : نہیں، میں تو برابر چکر لگاتی رہتی ہوں۔

رام سہائے مل : اور کوئی اندر نہ آنے پائے۔ مرد، عورت، بچہ۔

بھاگ وتی : نہیں، قصور ہوگا تو میرا ہوگا۔ میں کہہ دوں گی کہ میں نے آپ کو بتائے بغیر کیا ہے۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ جان پہچان کی کوئی عورت یا بچّہ پناہ مانگے اور میں اسے پناہ نہ دوں۔

© NCERT not to be republished

رام سہائے مل : (بھاگ وتی کو دیر تک غور سے دیکھ کر) معلوم ہوتا ہے تم نے مجھے بتائے بغیر کسی کو گھر میں چھُپا لیا ہے۔ اب تو ہماری جان پر ماتما کی دیا سے ہی بچ سکتی ہے.....تمھارا دل اتنا کمزور ہے تو تم مجھے کیوں نہیں بلا لیتی ہو؟

بھاگ وتی : میں چاہتی ہوں کہ آپ کو معلوم ہی نہ ہو۔

رام سہائے مل : یہ کون مانے گا کہ میرے گھر میں آدمی چھپے ہیں اور مجھے معلوم نہیں۔

بھاگ وتی : آدمی نہیں، لاوارث عورتیں بھوکے پیاسے بچے!

رام سہائے مل : کس کی عورتیں، کس کے بچے؟

بھاگ وتی : یہ میں پوچھتی ہی نہیں ہوں۔

رام سہائے مل : یا پوچھا ہے اور مجھے بتانا نہیں چاہتی ہو۔ ہمارے محلے میں ایسے لوگ ہیں ہی نہیں جنھوں نے بغاوت میں حصّہ لیا ہو۔ یہ عورتیں اور بچے تو باہر سے آئے ہوں گے۔ (بھاگ وتی زمین پر بیٹھ کر اور اپنا منھ بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔) بتاؤ تو یہ ہیں کون؟ کبھی پوچھ تا چھ ہو تو میں جواب تو دے سکوں (بھاگ وتی سر ہلاتی ہے۔) اچھا، نہ بتاؤ۔ (خاموشی) جب لڑائی ہو رہی تھی تو تمھاری زبان پر تین چار نام رہا کرتے تھے............بخت خاں کی آل اولاد یہاں تھی ہی نہیں، سدھاری سنگھ بھی باہر کا آدمی ہے.....کیا کسی مسلمان عورت کو پناہ دی ہے؟.......ہندو عورتوں میں تو تمھارے رانی کشن کنور سے تعلقات تھے۔ نہار سنگھ روپیہ وصول کرنے آنا چاہتا تو زمین تیار کرنے سے پہلے اسی کو بھیجتا تھا......مگر کیا معلوم رانی بلّبھ گڑھ میں ہے یا یہاں۔ بہر حال، جہاں بھی ہو، کوئی نہ کوئی اس کا پتہ دے گا ضرور..........اگر نہار سنگھ کو پکڑ لیا ہے تو شاید اس کو تلاش نہ کریں۔

بھاگ وتی : پکڑ لیا ہے! (پھر زور سے روتی ہے)

رام سہائے مل : پکڑ لیا ہے تو اب تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اُس کے برابر سونا دے کر اسے مول لینا چاہو تو نہ دیں گے.......تو رانی کشن کنور نے تمھارے یہاں پناہ لی ہے..........بے چاری! (رام سہائے سے اب اور کھایا نہیں جاتا۔ برتن سامنے سے کھسکا دیتا ہے۔ پانی پینا چاہتا ہے مگر پیالا دیر تک ہاتھ میں لیے رہتا ہے اور پی نہیں پاتا۔) کیا بہت رو رہی ہے؟

بھاگ وتی : (سر ہلا کر) نہیں، اس کا افسوس کر رہی ہے کہ جہادی عورتوں کے ساتھ میدان میں نہیں گئی اور ماری نہیں گئی۔

© NCERT not to be republished

رام سہائے مل : رام رام، کیا ہمت ہے۔ اس کو اچھی طرح رکھنا۔ میں بھی کبھی اس کے درشن کروں گا........اس کا ہمارے گھر میں رہنا کچھ ایسا خطرناک نہیں ہے۔ مسلمان عورت کی بات اور ہے۔

بھاگ وتی : ایک مسلمان بہن بھی ہے۔

رام سہائے مل : ہائے! کون؟

بھاگ وتی : سلمٰی۔

رام سہائے مل : ارے وہی یوسف میاں کی منگیتر؟ وہ تو مورچوں پر لڑی بھی تھی۔

بھاگ وتی : ہاں اس نے گھروں کی چھتوں پر سے بھی گولی چلائی۔ رانی کشن کنور بھی اس کے ساتھ بندوق چلا رہی تھیں۔ پھر وہ زخمی ہوگئی۔ رانی کشن کنور نے نہ جانے کس طرح اس کو یہاں پہنچایا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ مر جائے گی، مگر اب بھلی چنگی ہے۔ سوچ رہی ہے کہ کسی طرح دلّی سے نکل جائے اور بخت خاں کی فوج میں مل جائے۔ رانی کشن کنور کہتی ہیں کہ وہ بھی ساتھ جائیں گی۔

رام سہائے مل : دیکھو، یہ نہیں ہوسکتا۔ میں اس پر تیار ہوں کہ وہ یہاں چھپی رہیں، اور جب خطرہ نہ رہے تو چپکے سے چلی جائیں۔ یہاں وہ سال بھر تک رہیں۔ مگر باہر جا کر پھر کہیں لڑائی میں شامل ہوئیں تو تم پکڑی جاؤ گی، اور مجھے تو ضرور پھانسی ہو جائے گی.......اور یوسف میاں کو کیا ہوا؟

بھاگ وتی : سلمٰی کو کچھ معلوم نہیں۔

رام سہائے مل : اور تم کو معلوم ہوگا تو بتاؤ گی نہیں۔

بھاگ وتی : سُنا ہے وہ آخر وقت تک لڑتے رہے۔ اردو بازار میں کسی گورے نے ایک عورت کے ساتھ بدتمیزی کی تھی اُسے جان سے مار دیا۔ اس میں نہ معلوم کتنے پکڑے گئے، مگر وہ نہیں تھے۔ کہتے ہیں اب اردو بازار پر گولہ باری ہوگی۔ ایک مکان بھی کھڑا نہ چھوڑا جائے گا۔

رام سہائے مل : اب پرماتما بچائے ہم سب کو۔

(ایک عورت گھبرائی ہوئی اندر آتی ہے، اُس کے منھ سے بات نہیں نکلتی۔ پھر ایک ملازم آتا ہے۔)

ملازم : سرکار، دروازے پر چار سپاہی آئے ہیں۔ کہتے ہیں دروازہ کھولو، ہم تلاشی لیں گے۔

رام سہائے مل : میرے گھر میں نہیں آسکتے۔ میرے پاس امان کا پروانہ ہے۔

ملازم : سرکار، وہ ہماری بات نہیں مانیں گے۔
بھاگ وتی : پروانہ میرے پاس ہے۔ چلو میں دکھا دوں گی۔
رام سہائے مل : تم کہاں جاؤ گی؟
بھاگ وتی : میں نہیں جاؤں گی تو اور کون جائے گا؟ میں نے مشہور کر دیا ہے کہ آپ انگریز کمانڈروں سے بات چیت کر رہے ہیں، گھر پر نہیں ہیں۔
رام سہائے مل : نہیں، تم بیٹھو، میں جاتا ہوں۔

(بھاگ وتی جلدی سے دِیا بجھا کر بھاگ جاتی ہے۔ رام سہائے مل اندھیرے میں بیٹھا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد دائیں طرف سے بھاگ وتی اُلٹے پاؤں چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چار سپاہی اسے سنگینوں سے دھمکا رہے ہیں۔ پہلا سپاہی ان کا سردار معلوم ہوتا ہے۔

پہلا سپاہی : بتا کہاں ہیں وہ دونوں!
بھاگ وتی : (سہمی ہوئی رُوہانسی، مگر بہت دبی آواز میں) یہاں کوئی نہیں چھُپا ہے۔
پہلا سپاہی : یہاں دو عورتیں چھُپی ہیں۔ ہمارے آدمیوں نے اُن کو گولی چلاتے دیکھا، پھر وہ بھاگ کر اِس گھر میں آتے ہوئے دیکھی گئیں۔ رام سرن اس عورت کو لے جا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کرو، باقی تین آدمی فیر کرو۔
(رام سرن بھاگ وتی کی طرف بڑھتا ہے۔)
رام سہائے مل : ارے تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ ایک بے قصور عورت کو، اس طرح مار رہے ہو۔
پہلا سپاہی : اچھا، لالا جی چھُپے بیٹھے ہیں، سوچا تھا للائن ہم کو بہلا پھسلا کر رخصت کر دے گی۔ رام سرن! کھڑا کرو انھیں بھی للائن کے ساتھ۔
بھاگ وتی : (چلّا کر) ارے مجھے مار ڈالو، انھیں چھوڑ دو! یہ بالکل کچھ نہیں جانتے! ارے یہ بالکل بے قصور ہیں۔
پہلا سپاہی : اچھا یہ بے قصور ہیں تو تمھیں تو معلوم ہے کہ دونوں عورتیں کہاں چھُپی ہیں۔
بھاگ وتی : (ویسے ہی چلّا کر) ارے انھیں چھوڑ دو! ہائے میری قسمت! یہ بالکل کچھ نہیں جانتے، ہائے ہائے!
(اسٹیج کے دائیں طرف کے کونے سے سلمٰی اور کشن کنور اندر آتی ہیں۔)
سلمٰی : اِن دونوں کا پیچھا چھوڑ دو۔ ہم آ گئے ہیں ہمیں جو سزا چاہو دے دو۔ سیٹھ صاحب اور ان کی بیوی بالکل

بے قصور ہیں۔

پہلا سپاہی : (سلمیٰ اور کشن کنور کو غور سے دیکھنے کے بعد) مجھے تو تم اسی گھرانے کی عورتیں معلوم ہوتی ہو۔

کشن کنور : اِن دونوں کو چھوڑ دو۔ ہم تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ شہر میں ہزاروں آدمی ہم کو پہچان لیں گے۔

پہلا سپاہی : ہاں، میں تم کو لے کر باہر چلا جاؤں اور اس دوران میں اصلی مجرم نکل جائیں۔

سلمیٰ : تمھاری مرضی، بے گناہوں کا خون کرنا تو تمھارا کام ہی ہے۔

پہلا سپاہی : اچھا تو بتاؤ، کیا نام ہیں تمھارے؟

سلمیٰ : سلمیٰ

کشن کنور : کشن کنور

پہلا سپاہی : تم اپنے جرم کا اقبال کرتی ہو؟

سلمیٰ : ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم اپنے ملک کے لیے، اپنے بادشاہ کی طرف سے لڑے ہیں۔

پہلا سپاہی : تم لڑائی میں شریک ہوئی ہو؟

سلمیٰ : دِل و جان سے ہم شریک ہوئے، ہم نے دوسروں کو لڑنے پر آمادہ کیا۔ ہم مورچوں پر لڑے، ہم نے دشمنوں کو مارا۔

کشن کنور : ہمیں افسوس اس کا ہے کہ اس سے زیادہ نہ کر سکے۔

پہلا سپاہی : تو جاؤ کھڑی ہو جاؤ دیوار سے لگ کر۔

سلمیٰ : ہم دیوار سے لگ کر کیوں کھڑے ہوں؟ ہم صحن میں کھڑے ہوں گے اور تمھاری بندوقوں پر ہنسیں گے۔

پہلا سپاہی : تو چلو کھڑی ہو جاؤ! اسی بات پر۔

(سلمیٰ اور کشن کنور بیچ صحن میں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ پہلے سپاہی کے اشارے پر تین سپاہی اُن سے تین چار قدم ہٹ کر اور ایک گھٹنے کو زمین پر ٹیک کر بندوقیں تانتے ہیں۔ بھاگ وتی چیخ مار کر سپاہیوں اور دونوں عورتوں کے بیچ میں آ جاتی ہے۔ مگر غش کھا کر گر پڑتی ہے۔ سپاہی بندوقیں تانے رہتے ہیں، مگر انھیں فائر کرنے کا حکم نہیں ملتا۔ سلمیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ ہے اور وہ بندوقوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ کشن کنور کی نظر آسمان کی طرف ہے، اس کے چہرے پر وجد کی کیفیت ہے۔ سپاہی فائر نہیں کرتے۔ ایک بارگی پہلا

© NCERT not to be republished

سپاہی گھٹنوں پر جاتا ہے۔)

پہلا سپاہی : (ہاتھ جوڑ کر) ہماری خطا معاف کیجیے۔ہم صرف اس کا یقین کرنا چاہتے تھے کہ آپ وہی ہیں جنھیں ڈھونڈ کر لانے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا۔

(تقدیر کے اس انقلاب کو برداشت کرنا سلمٰی اور کشن کنور کے بس میں نہیں۔کشن کنور چیخ مار کر گر پڑتی ہے۔ سلمٰی کی آنکھیں چڑھ جاتی ہیں، ہاتھ پاؤں جواب دے دیتے ہیں اور وہ زمین پر ڈھیر ہو جاتی ہے۔)

رام سہائے مل : ظالموں! اب کب تک ان بے چاریوں کو ستاؤ گے؟ ارے مارنا ہے تو ایک دفعہ مار دو!

پہلا سپاہی : (انتہائی ندامت کے انداز میں) ہم انھیں تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے، اُن کے دل کی آرزو پوری کرنا چاہتے تھے۔ہمیں جنرل بخت خاں نے انگریزی فوج کی وردیاں پہنا کر بھجوایا ہے کہ انھیں جلد سے جلد تلاش کر کے اُن کے پاس پہنچا دیں۔ہم نے اُن کو صحیح سلامت نہ پہنچایا تو ہمارے گولی مار دی جائے گی، یا انگریز ہمیں پکڑ کر پھانسی دے دیں گے۔ (بھاگ وتی اس دوران میں اُٹھ کھڑی ہوتی ہے، اور کشن کنور اور سلمٰی کے منھ پر پانی کے چھینٹے دیتی ہے اور انکے سر سہلاتی ہے۔)

بھاگ وتی : اُٹھو پیاری، تمھارے بخت خاں نے تمھیں بلایا ہے۔اپنے پیاروں کا بدلہ لو، اپنے ملک کی آبرو بڑھاؤ!

(آہستہ آہستہ سلمٰی اور کشن کنور کو ہوش آتا ہے۔وہ اُٹھ کر بیٹھتی ہیں۔ بھاگ وتی انھیں پانی پلاتی ہے۔)

پہلا سپاہی : آپ سے پھر آپ کے قدموں پر گر کر معافی مانگتا ہوں۔ (سلمٰی اور کشن کنور مسکرا دیتی ہیں۔) مگر ابھی ایک اور گستاخی کرنا ہے۔ہم آپ کو شہر کے باہر صرف قیدی بنا کر لے جا سکتے ہیں۔ہمیں آپ کی مُشکیں کسنا ہوں گی اور گلے میں رسیّاں باندھنا۔

(سلمٰی اور کشن کنور ایک دوسرے کی طرف دیکھتی ہیں۔ پھر دونوں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ سپاہی جلدی جلدی اُن کی مشکیں کستے ہیں اور گلے میں پھندا ڈالتے ہیں۔ پھر ایک سپاہی آگے، دو پیچھے اٹنشن ہو جاتے ہیں۔ پہلا سپاہی روانگی کا حکم دیتا ہے۔)

—— محمد مجیب

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ اور معنی:

ڈیوٹ	:	پُرانی قسم کا لکڑی کا چراغ دان
روانسی (روہانسی)	:	رونے پر آمادہ
جہادی عورتیں	:	جہاد کرنے والی عورتیں، مراد وہ عورتیں جنھوں نے اپنے ملک کی حفاظت کے لیے جنگ میں حصّہ لیا
اَمان کا پروانہ	:	وہ حکم نامہ جس کے ذریعے تحفّظ کی ضمانت دی جائے
سنگین	:	ایک نکیلا ہتھیار جو بندوق کی نال پر لگایا جاتا ہے
فیر	:	فائر
مُشکیں کسنا	:	دونوں بازو پشت پر باندھنا

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- آپ پڑھ چکے ہیں کہ یہ ڈراما 1857 کے تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ اس آخری ایکٹ میں لالہ رام سہائے کی بیوی بھاگ وتی نے جنگِ آزادی میں شرکت کرنے والی دو جہادی عورتوں سلمیٰ اور رانی کشن کنور کو اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔
- 1857 کی جنگِ آزادی میں ہندو مسلمان مرد اور عورتوں نے برابر کا حصّہ لیا۔ اس وقت یہ تفریق نہ تھی کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ بس ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح ملک آزاد ہو جائے اور انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ رام سہائے اور اس کی بیوی بھاگ وتی کے خیالات میں کیا فرق ہے؟

2۔ رام سہائے مل کے دروازے پر سپاہی آئے تو اس نے کیوں کہا کہ میرے پاس امان کا پروانہ ہے؟

3۔ سپاہی سلمٰی اور کشن کنور کی مشکیں کس کر شہر سے باہر کیوں لے جانا چاہتے تھے؟

عملی کام:

○ اپنی کلاس میں الگ الگ کرداروں کے ذریعے اس ڈرامے کے مکالمے ادا کیجیے۔

© NCERT not to be republished

سیّد عابد حسین

(1896 – 1978)

ڈاکٹر سیّد عابد حسین کا وطن داعی پور، ضلع فرخ آباد (اتر پردیش) تھا۔ عابد حسین کی پیدائش بھوپال (مدھیہ پردیش) میں ہوئی، جہاں اُن کے دادا اور والد ملازمت کرتے تھے۔ سیّد عابد حسین کی والدہ کا تعلق لکھنؤ کے ایک تعلقہ دار گھرانے سے تھا۔ اُن کا بچپن داعی پور اور لکھنؤ میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں اور ثانوی تعلیم بھوپال میں حاصل کی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی، برطانیہ اور برلن یونیورسٹی، جرمنی میں حاصل کی۔ سیّد عابد حسین نے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ جرمنی سے واپس آکر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے ساتھ جامعہ ملیہّ اسلامیہ میں کام کرنے لگے۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عابد حسین تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے رہے۔ انھوں نے سب سے پہلے 1926 میں ایک ڈراما ''پردۂ غفلت'' لکھا۔ جرمن زبان کی کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جن میں گوئٹے کی ''فاؤسٹ'' سب سے اہم ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے مہاتما گاندھی کی خودنوشت کا ترجمہ ''تلاشِ حق'' کے نام سے اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی ڈسکوری آف انڈیا کا ترجمہ ''تلاشِ ہند'' کے نام سے اُردو میں کیا۔ اُردو کے علاوہ انگریزی میں بھی کئی کتابیں لکھیں جن میں ''قومی تہذیب کا مسئلہ'' اور ''ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں'' اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوئیں۔ انھوں نے اردو کے علمی سرمایے میں قابلِ قدر اضافہ کیے۔ وہ دو مشہور جرائد ''اسلام اور عصر جدید'' اور ''اسلام اینڈ دی موڈرن ایج'' کے بانی مدیر بھی رہے۔

'چوری اور اس کا کفّارہ' گاندھی جی کی آپ بیتی کے اردو ترجمے سے ماخوذ ہے۔

© NCERT not to be republished

5012CH06

چوری اور اس کا کفّارہ

ہائی اسکول میں جن لڑکوں سے مجھ سے مختلف اوقات میں دوستی رہی ان میں سے دو قلبی دوست کہے جاسکتے ہیں۔ایک سے میری دوستی زیادہ دن نہیں رہی۔ میں نے اُسے نہیں چھوڑا بلکہ اُس نے مجھے چھوڑ دیا، اس قصور پر کہ میں نے دوسرے سے میل جول پیدا کیا۔اس دوسری دوستی کو میں اپنی زندگی کا ایک الم ناک واقعہ سمجھتا ہوں۔ یہ بہت دن قائم رہی۔ میں نے اسے اصلاح کے جوش میں شروع کیا تھا۔

میرا یہ رفیق اصل میں میرے منجھلے بھائی کا دوست تھا۔یہ دونوں ہم سبق تھے۔ میں اس کی کمزوریوں سے واقف تھا،مگر اسے وفادار دوست سمجھتا تھا۔میری ماں نے، میرے بڑے بھائی نے، میری بیوی نے مجھے متنبہ کیا کہ تمھاری صحبت خراب ہے۔بیوی کی بات تو میں شوہری کے غرور میں کب سنتا تھا،لیکن ماں اور بڑے بھائی کی رائے کے خلاف عمل کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔پھر بھی میں نے اُن سے عذر معذرت کی اور کہا ''میں جانتا ہوں کہ اس میں وہ کمزوریاں ہیں جو آپ نے بتائیں مگر آپ کو اس کی اچھائیوں کی خبر نہیں۔وہ مجھے گمراہ نہیں کرسکتا کیوں کہ میں اس سے اس نیّت سے ملتا ہوں کہ اس کی اصلاح کروں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنے اطوار درست کرے تو بڑا اچھا آدمی ہوجائے گا۔میری التجا ہے کہ آپ میری طرف سے تردُّد نہ کریں۔''

اس سے اُن کا اطمینان تو نہیں ہوا مگر انھوں نے میری توجیہہ مان لی اور مجھے میری راہ چلنے دیا۔آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔جو شخص کسی کی اصلاح کرنا چاہتا ہے وہ اُس کے ساتھ شیر وشکر ہوکر نہیں رہ سکتا۔سچّی دوستی روحانی اتحاد کا نام ہے جو اس دنیا میں بہت کم ہوتا ہے۔صرف اُن ہی لوگوں میں جن کی طبیعت ایک سی ہو، دوستی پوری

© NCERT not to be republished

طرح مکمل اور پائدار ہوسکتی ہے۔ دوستوں میں ہر ایک کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے، اسی لیے دوستی میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ میری رائے میں کسی ایک شخص سے ایک جان دو قالب ہوجانے سے پرہیز کرنا چاہیے، کیوں کہ انسان پر بہ نسبت نیکی کے بدی کا اثر جلد پڑتا ہے اور جو شخص خدا کا دوست ہونا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ یا تو اکیلا رہے یا ساری دنیا سے دوستی کرے۔ ممکن ہے کہ میری رائے غلط ہو، مگر مجھے تو قلبی دوستی پیدا کرنے میں ناکامی ہوئی۔

جن دنوں میں میری ملاقات اس دوست سے ہوئی، راج کوٹ میں ''ریفارم'' کا بڑا زور تھا، اس نے مجھے بتایا کہ ہمارے بہت سے استاد چھُپ کر شراب اور گوشت کا استعمال کرتے ہیں۔ اس نے راج کوٹ کے بہت مشہور آدمیوں کے نام بھی لیے جو اس جماعت میں شریک تھے۔ اس نے کہا کہ اس زُمرے میں ہائی اسکول کے بعض لڑکے بھی ہیں۔ مجھے یہ سن کر تعجب اور رنج ہوا۔

میں بز دل بھی تھا۔ مجھے ہر وقت چوروں، بھوتوں اور سانپوں کا کھٹکا رہتا تھا۔ رات کو گھر سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اندھیرے سے میری روح فنا ہوتی تھی۔ میرے لیے اندھیرے میں سونا تقریباً ناممکن تھا، کیوں کہ مجھے وہم ہوتا تھا کہ ایک طرف سے بھوت چلے آرہے ہیں، دوسری طرف سے چور، تیسری طرف سے سانپ، بغیر کمرے میں روشنی رکھے مجھے سوتے نہ بنتا تھا۔ میں اپنے خوف کو اپنی کمسن بیوی پر کیوں کر ظاہر کرتا؟ میں جانتا تھا کہ ان میں مجھ سے زیادہ ہمت ہے اور مجھے اپنے اوپر شرم آتی تھی۔ انھیں سانپوں اور بھوتوں کا کوئی ڈر نہ تھا۔ وہ اندھیرے میں ہر جگہ چلی جاتی تھیں۔ میرے دوست کو میری ان کمزوریوں کا حال معلوم تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں زندہ سانپ ہاتھ پر رکھ سکتا ہوں۔ چوروں کا مقابلہ کرسکتا ہوں اور بھوتوں کا قائل ہی نہیں ہوں۔

میرے ایک عزیز کو اور مجھے سگریٹ پینے کا چسکا لگ گیا۔ یہ بات نہ تھی کہ ہم اس عادت کو اچھا سمجھتے ہوں یا سگریٹ کی خوشبو پر ریجھے ہوں۔ ہمیں تو صرف منھ سے دھواں نکالنے میں ایک خیالی لطف آتا تھا۔ میرے چچا اس کے عادی تھے اور جب ہم انھیں سگریٹ پیتے دیکھتے تھے تو ہمارا جی چاہتا تھا کہ اُن کی طرح ہم بھی پئیں۔ مگر ہمارے پاس دام تو تھے نہیں اس لیے ہم نے ابتدا اس طرح کی کہ ہم سگریٹ کے ٹکڑے جو ہمارے چچا پی کر پھینک دیتے تھے چُرا لاتے تھے۔

© NCERT not to be republished

مگر یہ ٹکڑے ہر وقت نہیں مل سکتے تھے اور ان سے دھواں بھی زیادہ نہیں نکلتا تھا۔اس لیے ہم نے نوکروں کے جیب خرچ میں سے پیسے چرانا شروع کیے کہ ہندوستانی سگریٹ خریدیں مگر مصیبت یہ تھی کہ انھیں رکھیں کہاں، کیوں کہ ظاہر ہے کہ ہم بڑوں کے سامنے تو سگریٹ پی نہیں سکتے تھے۔چند ہفتے تک تو ہم کسی نہ کسی طرح ان چرائے ہوئے پیسوں سے کام چلاتے رہے۔اس عرصے میں ہم نے سنا کہ ایک درخت کی ڈال میں مسامات ہوتے ہیں اور اس کے ٹکڑے سگریٹ کی طرح پیے جاسکتے ہیں۔ہم انھیں لے آئے اور پینا شروع کر دیا۔

لیکن ان چیزوں سے ہماری تسلّی نہ ہوتی تھی۔آزادی نہ ہونا ہمیں کھلنے لگا۔ہم سے یہ برداشت نہ ہوتا تھا کہ ہم بغیر بڑوں کی اجازت کے کچھ نہ کرسکیں۔آخر زندگی سے متنفر ہوکر ہم نے خودکشی کی ٹھان لی۔

مگر اب یہ سوال تھا کہ خودکشی کیسے کی جائے؟ زہر کھائیں تو زہر کہاں سے لائیں؟ ہم سے کسی نے کہا کہ دھتورے کے بیج زہرِ قاتل ہیں۔ہم دوڑے ہوئے جنگل میں گئے اور بیج لے آئے۔ہم نے شام کے وقت کو اس کام کے لیے مبارک سمجھا۔ہم ''کیدار جی مندر'' میں گئے۔وہاں کے چراغ میں گھی ڈالا۔''درشن'' لیے اور کوئی سونی جگہ ڈھونڈنے لگے۔مگر ہماری ہمت نے جواب دے دیا۔فرض کرو کہ ہم فوراً نہ مرے! اور آخر مرنے سے فائدہ ہی کیا؟ آزادی نہیں ہے تو نہ سہی، اسی حالت کو کیوں نہ برداشت کریں؟ پھر بھی ہم دو تین بیج نگل ہی گئے۔ہم دونوں موت سے ڈر گئے اور ہم نے طے کیا کہ ''رام جی مندر'' جا کر حواس درست کریں اور خودکشی کا خیال چھوڑ دیں۔

مجھے معلوم ہوگیا کہ خودکشی کرنا اتنا سہل نہیں جتنا اس کا ارادہ کرنا اور اس دن سے جب کبھی میں سنتا ہوں کہ فلاں شخص خودکشی کی دھمکی دے رہا ہے تو مجھ پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔

خودکشی کے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں نے سگریٹ کے ٹکڑے پینا اور سگریٹ کے لیے نوکروں کے پیسے چرانا چھوڑ دیا۔جب سے میں بالغ ہوا ہوں مجھے کبھی تمبا کو پینے کی خواہش نہیں ہوئی، اور میں اس عادت کو تہذیب کے خلاف، صفائی کے خلاف اور مُضر سمجھتا ہوں۔یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ ساری دنیا میں لوگ تمبا کو پینے پر کیوں جان دیتے ہیں۔مجھ سے تو ریل کے ڈبّے میں جہاں تمبا کو پینے والے بھرے ہوں نہیں بیٹھا جاتا۔میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔

لیکن اس سے کہیں بڑی چوری کا میں کچھ دن بعد مرتکب ہوا جب میں نے پیسے چرائے تو میری عمر بارہ تیرہ سال کی بلکہ اس سے بھی کم تھی۔ دوسری چوری کے وقت میں پندرہ برس کا تھا۔ اس بار میں نے اپنے گوشت کھانے والے بھائی کے بازوبند سے ایک سونے کا ٹکڑا چرایا۔ یہ بھائی پچیس روپے کے مقروض تھے۔ وہ بازو پر خالص سونے کا بازوبند باندھا کرتے تھے۔ اس میں سے ایک ٹکڑا کاٹ لینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

چنانچہ ایسا کیا گیا اور قرض ادا ہوگیا، لیکن اتنا سنگین جرم تھا کہ مجھ سے کسی طرح برداشت نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے عہد کرلیا کہ پھر کبھی چوری نہ کروں گا۔ میرا یہ بھی ارادہ ہوا کہ اپنے والد کے سامنے جرم کا اعتراف کرلوں مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ مجھے والد کے ہاتھ سے مار کھانے کا ڈر ہو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے ہم لوگوں کو کبھی نہیں مارا۔ خوف تھا تو یہ کہ انھیں بہت دُکھ ہوگا۔

آخر میں یہ فیصلہ کیا کہ میں اعتراف نامہ لکھ کر اپنے والد کو دوں اور ان سے معافی کی درخواست کروں۔ میں نے سارا واقعہ ایک کاغذ پر لکھا اور خود لے جاکر انھیں دیا۔ اس رُقعے میں مَیں نے نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کیا بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ مجھے اس کی کافی سزا دی جائے اور آخر میں ان سے درخواست کی کہ میرے قصور کے بدلے وہ اپنا دل نہ کڑھائیں۔ میں نے اس بات کا عہد کیا کہ پھر کبھی چوری نہ کروں گا۔

میں نے اعتراف نامہ انھیں دیا تو میں کانپ رہا تھا۔ وہ ان دنوں ناسور میں مبتلا تھے اور صاحب فراش تھے۔ ایک کھُرّے تخت پر لیٹے رہتے تھے۔ میں نے رقعہ انہیں دے دیا اور چوکی کے سامنے بیٹھ گیا۔

انھوں نے اسے اوّل سے آخر تک پڑھا اور موتیوں کے قطرے ٹپ ٹپ اُن کے رخساروں پر اور کاغذ پر گرنے لگے۔ دم بھر وہ آنکھیں بند کرکے سوچتے رہے اس کے بعد انہوں نے رقعہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ اسے پڑھنے کے لیے پہلے بیٹھ گئے تھے اب وہ پھر لیٹ گئے۔ میں بھی رونے لگا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ انھیں کیسا دُکھ ہے۔ اگر میں نقّاش ہوتا تو آج اتنے دن کے بعد بھی پورے منظر کی تصویر کھینچ دیتا۔ اس واقعہ کی یاد میرے دل میں اب تک تازہ ہے۔

ان محبت کے موتیوں نے میرے دل کو پاک کردیا اور میرے گناہ کو دھوڈالا۔ اس محبت کو وہی خوب جانتا ہے جس نے اس کا لطف اٹھایا ہے۔

© NCERT not to be republished

یہ میرے لیے 'اَہمسا' کا عملی سبق تھا۔اس وقت تو مجھے اس میں سوائے باپ کی محبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا، مگر آج میں جانتا ہوں کہ یہ خالص 'اہمسا' تھا۔جب یہ 'اَہمسا' ہَمہَ گیر ہوجاتا ہے تو جس چیز کو چھوتا ہے اس کی کایا پلٹ دیتا ہے۔اس کی قوت کی کوئی انتہا نہیں۔

اس طرح کا شاندار عَفو میرے والد کی طبیعت سے بعید تھا۔میرا خیال تھا کہ وہ خفا ہوجائیں گے، سر پیٹ لیں گے۔مجھے سخت سُست کہیں گے۔لیکن ان کا سکون دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے صاف صاف اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا۔گناہ کا پورا اعترف اور آئندہ اس سے باز رہنے کا عہد، ایسے شخص کے سامنے جو انھیں قبول کرنے کا اہل ہے، تو بہ کی خالص ترین صورت ہے۔مجھے معلوم ہے کہ میرے اس اعتراف سے والد کو میری طرف سے پورا اطمینان ہوگیا اور انھیں مجھ سے جو محبت تھی وہ بے انتہا بڑھ گئی۔(تلخیص)

مترجم : سیّد عابد حسین

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ ومعنی:

کفّارہ	:	گناہ یا قصور کا بدلہ جو قصوروار کی طرف سے ادا ہو
قلبی دوست	:	دلی دوست، بہت قریبی دوست
مُتنبّہ کیا	:	خبردار کیا، آگاہ کیا
عذرمعذرت	:	کسی قصور یا کمی کی صفائی کے طور پر جو بات کہی جائے
تردُّد	:	پریشانی، الجھن
توجیہہ	:	وجہ بیان کرنا، دلیل دینا
ایک جان دو قالب	:	انتہائی دوستی، گویا جسم دو ہیں لیکن جان ایک
لغزش	:	غلطی، بھول چوک، گمراہی
مسامات	:	جِلد کے باریک سوراخ جن سے پسینہ نکلتا ہے
زہرِ قاتل	:	وہ زہر جس کے کھانے سے انسان مرجائے، مہلک زہر
مرتکب	:	کام میں ہاتھ ڈالنا، قصوروار

© NCERT not to be republished

صاحبِ فراش	:	وہ بیمار جو بستر سے نہ اُٹھ سکے
اَہِمسا	:	اہنسا، خون خرابے اور توڑ پھوڑ میں یقین نہ رکھنا یا ان باتوں پر عمل نہ کرنا، عدم تشدد
ہمہ گیر	:	جو سب پر چھایا ہو
عَفو	:	معافی، درگذر

غور کرنے کی بات:

© NCERT not to be republished

- یہ مضمون مہاتما گاندھی کی آپ بیتی *My Experiments With Truth* کے اردو ترجمے "تلاشِ حق" سے لیا گیا ہے۔ مضمون پڑھتے وقت آپ کو کسی بھی سطر پر یہ شبہہ نہیں ہوگا کہ یہ ترجمہ ہے۔ اچھے اور کامیاب ترجمے کی یہی خوبی ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہو۔
- مہاتما گاندھی نے اپنی سوانح لکھتے وقت اپنی شخصی کمزوریوں کو چھپایا نہیں ان پر کسی طرح کا پردہ نہیں ڈالا اور کھلے دل سے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کیا اور خود ہی اپنی اصلاح کی۔ ایک اچھی آپ بیتی کی پہلی خوبی یہی ہے کہ اس میں کسی طرح کا تصنع نہ ہو۔ اس طرح کی آپ بیتیاں پڑھنے والے کے لیے لطف کے ساتھ ساتھ عبرت اور اصلاح کے مواقع بھی فراہم کرتی ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ ''انسان پر بہ نسبت نیکی کے بدی کا اثر جلد پڑتا ہے''، ایسا کیوں؟ واضح کیجیے۔

2۔ مہاتما گاندھی نے اپنی غلطیوں کے کفارے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟

3۔ گاندھی جی کا اعتراف نامہ پڑھ کر ان کے والد پر کیا اثر ہوا؟

عملی کام:

- ایک مضمون لکھیے۔ ''چوری ایک بری عادت ہے۔''
- گاندھی جی کی زندگی سے متعلق کتابیں حاصل کر کے ان کا مطالعہ کیجیے۔

© NCERT not to be republished

سرسیّد احمد خاں

(1817 – 1898)

سیّد احمد خاں دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔سیّد احمد نے اپنے زمانے کے اہلِ کمال سے فیض حاصل کیا۔1839 میں انھوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کی اور اس سلسلے میں مختلف شہروں میں ان کی تقرری ہوئی۔1862 میں جب وہ غازی پور میں تھے، انھوں نے 'سائنٹفک سوسائٹی' کے نام سے ایک انجمن بنائی۔اس انجمن کا مقصد ہندوستانیوں میں مختلف علوم، خاص کر سائنسی علوم کے مطالعے کو فروغ دینا تھا۔1869 میں سیّد احمد خاں ایک سال کے لیے انگلستان گئے۔واپس آ کر انہوں نے انگریزی کے علمی اور سماجی رسالوں کی طرز پر اپنا ایک رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا۔اس سے اردو میں مضمون نگاری کو بہت ترقی ملی۔

سیّد احمد خاں نے علی گڑھ میں 1857 میں ایک اسکول قائم کیا۔یہ اسکول 1878 میں 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' اور پھر 1920 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ہندوستان کا ایک نمایاں تعلیمی ادارہ بن گیا۔

1878 میں سیّد احمد خاں کو 'سر' کا خطاب ملا۔اس لیے لوگ انھیں 'سرسیّد' کے نام سے جانتے ہیں۔سرسیّد آخر عمر تک قومی سرگرمیوں، کالج کی دیکھ بھال اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ان کی متعدد تصانیف میں 'آثارالصّنادید'، 'اسباب بغاوتِ ہند' اور 'سرکشی ضلع بجنور' خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ان کے مضامین کئی جلدوں میں شائع ہوئے جن میں سائنس، فلسفہ، مذہب اور تاریخ سے متعلق مضامین ہیں۔

سرسید نے لمبی لمبی تحریروں کے بجائے چند صفحات میں کام کی بات کہنے کا طریقہ رائج کیا۔اردو ایسّے (Essay) اور انشائیہ نگاری کی روایت کو فروغ دینے میں سرسیّد اور ان کے رفیقوں نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔سرسیّد اپنے زمانے کے بڑے مصلحین میں شمار کیے جاتے ہیں۔انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔اپنی قوم کو جدید تعلیم کی طرف مائل کرنے میں وہ ہمیشہ سرگرم رہے۔'عورتوں کے حقوق' پر ان کا یہ مضمون بھی ان کی اصلاحی خدمات کی ترجمانی کرتا ہے۔

© NCERT not to be republished

5012CH07

عورتوں کے حقوق

تربیت یافتہ ملک اِس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں۔کوئی وجہ نہیں کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جاوے۔

بااین ہمہ، ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر، قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے، اُس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔مسلمان قانون میں عورتوں کے مردوں کے برابر حقوق اور اختیارات تسلیم کیے گئے ہیں۔

حالت نابالغی میں جس طرح مرد، اسی طرح عورت، بے اختیار اور ناقابلِ معاہدہ متصوّر ہے؛ اِلّا بعد بلوغ وہ بالکل مثلِ مرد کے مختار ہے اور ہر ایک معاہدہ کے لائق ہے۔

جس طرح مرد، اُسی طرح عورت، اپنی شادی کرنے میں مختار ہے۔جس طرح کہ مرد کا بے رضا نکاح نہیں ہوسکتا؛ اسی طرح عورت کی بلا رضا مندی نکاح نہیں ہوسکتا۔

وہ اپنی تمام جائداد کی خود مالِک اور مختار ہے اور ہر طرح اس میں تصرّف کرنے کا اُس کو اختیار حاصل ہے۔

وہ مِثل مرد کے ہر قسم کے معاہدے کی صلاحیت رکھتی ہے؛ اور اس کی ذات، اور اُس کی جائداد، اُن معاہدوں اور دستاویزوں کی بابت جواب دہ ہے، جو اُس نے تحریر کی ہوں۔

جو جائداد، قبل شادی اور بعد شادی اس کی ملکیت میں آئی ہو؛ وہ خود اس کی مالک ہے، اور خود اس کے محاصل کی لینے والی ہے۔

وہ مِثل مرد کے دعویٰ بھی کرسکتی ہے، اور اُس پر بھی دعویٰ ہوسکتا ہے۔

وہ اپنے مال سے ہر ایک جائداد خرید سکتی ہے، اور جو چاہے اُس کو بیع کرسکتی ہے۔وہ مِثل مرد کے ہر قسم کی جائداد کو ہِبہ، اور وصیت اور وقف کرسکتی ہے، وہ رشتہ داروں اور شوہر کی جائداد میں سے بہ ترتیب وراثت ورثہ پاسکتی ہے۔

وہ تمام مذہبی نیکیوں کو جو مرد حاصل کرسکتا ہے حاصل کرسکتی ہے۔

© NCERT not to be republished

وہ تمام گناہوں اور ثواب کے عوض دنیا اور آخرت میں وہی سزا و جزا پاسکتی ہے، جو مرد پا سکتا ہے......۔

اِس مقام پر جو ہم کو بحث ہے، وہ صرف مردوں کے عورتوں کے ساتھ حُسنِ سلوک، اور حُسنِ معاشرت اور تواضع اور خاطر داری اور محبت اور پاس خاطر اور اُن کی آسائش اور آرام اور خوشی اور فرحت کی طرف متوجہّ ہونا اور ان کو ہر طرح پر خوش رکھنا، اور بعوض اِس کے کہ عورتوں کو اپنا خدمت گذار تصور کریں، اُن کو اپنا انیس اور جلیس، اور رنج و راحت کا شریک اور اپنے کو اُن کی اور اُن کو اپنی باعثِ مسرت اور تقویت کے سمجھنے پر، بحث ہے بلاشبہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے، تربیت یافتہ ملکوں میں عورتوں کے ساتھ یہ تمام مراتب بخوبی برتے جاتے ہیں اور مسلمان ملکوں میں ویسے نہیں برتے جاتے، نعوذُ باللہ منہا!

مہذب قوموں نے، باوجود یہ کہ اُن کے یہاں کا قانون نسبت عورتوں کے نہایت ہی ناقص اور خراب تھا، اپنی عورتوں کی حالت کو نہایت اعلیٰ درجے کی ترقی پر پہنچایا ہے، اور مسلمانوں نے، باوجود یہ کہ اُن کا مذہبی قانون نسبت عورتوں کے، اور اُن کی حالت بہتری کے تمام دنیا کے قوانین سے بہتر اور عمدہ تھا مگر اُنھوں نے اپنے نامہذّب ہونے سے ایسا خراب برتاؤ عورتوں کے ساتھ اختیار کیا ہے، جس کے سبب تمام قومیں اُن کی حالت پر ہنستی ہیں اور ہماری ذاتی برائیوں کے سبب، اس وجہ سے کہ قوم کی قوم ایک حالت پر ہے اِلا ماشاء اللہ اس قوم کے مذہب پر عیب لگاتی ہیں۔

پس اب یہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم اِن باتوں کی غیرت نہ کریں اور اپنے چال چلن کو درست نہ کریں؛ اور جیسا کہ مذہب اسلام روشن ہے، خود اپنے چال چلن سے اس کی روشنی کا ثبوت لوگوں کو نہ دکھائیں۔ (تلخیص)

—— سرسیّد احمد خاں

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

آفرینش	:	پیدائش
با ایں ہمہ	:	اِن سب کے باوجود۔ان سب کے ہوتے ہوئے، باوجود ان باتوں کے
اِلّا	:	اگر،سوائے
معاہدہ	:	سمجھوتہ، باہم قول وقرار
مُتصوّر	:	تصور کیا گیا،سوچا ہوا
جواب دہ	:	ذمہ دار، باز پرس کے قابل
تصّرف	:	خرچ،استعمال
محاصل	:	محصول کی جمع، لگان، مالگذاری،نفع
بیع	:	فروخت، بیچنا
ہِبہ کرنا	:	عطا کرنا،وقف کرنا
بعوض	:	بدلے میں، جواب میں
انیس	:	انس رکھنے والا،محبت کرنے والا دوست
جلیس	:	ساتھ بیٹھنے والا،ساتھی دوست
نعوذُباللہ منہا	:	ہم اس سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں
تقویت	:	طاقت،قوت
قوانین	:	قانون کی جمع، قاعدہ،دستور، ضابطہ
مہذّب	:	تہذیب یافتہ

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- اس مضمون میں سرسید نے عورتوں کے حقوق پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ مذہب اِسلام میں عورت اور مرد کو برابر کا درجہ دیا گیا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ اسلام میں عورتوں کو کیا حقوق اور اختیارات دیے گئے ہیں؟

2۔ تربیت یافتہ ملکوں میں عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟

3۔ مردوں کو عورتوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرنا چاہیے؟

عملی کام:

- ہمارے ملک میں عورتوں کی حالت پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
- مختلف شعبوں میں شہرت حاصل کرنے والی پانچ ہندوستانی عورتوں کے نام لکھیے۔

© NCERT not to be republished

مولوی عبدالحق

(1870 – 1961)

بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو زبان کے ان شیدائیوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی اس زبان کی خدمت میں صرف کردی۔ وہ قصبہ ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔1894 میں ایم۔اے۔او۔کالج علی گڑھ سے بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد پنجاب اور حیدرآباد میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں بطور پرنسپل کام کیا۔عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے صدر اور پروفیسر رہے۔انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری مقرر ہوئے اور زندگی بھر اس ادارے کی ترقی اور کامیابی کے لیے جی جان سے کوشش کرتے رہے۔انجمن کی جانب سے مولوی عبدالحق کی ادارت میں ایک سہ ماہی ادبی رسالہ ''اُردو'' جاری ہوا، جس نے تحقیقی، علمی اور ادبی میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔حیدرآباد یونیورسٹی نے ایل۔ایل۔ڈی اور علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگریاں دے کر مولوی عبدالحق کی مجموعی خدمات کا اعتراف کیا۔آزادی کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔

مولوی عبدالحق ایک محقق، سوانح نگار، زبان داں، لغت نویس، ماہر قواعد اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ان کی تحریروں پر حآلی کا سب سے زیادہ اثر ہے۔ بول چال کی سادہ زبان میں پُر خلوص جذبات کا بے لاگ اظہار کرتے ہیں۔ ہر بات خوب سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔عبارت میں الجھاؤ نہیں، مشکل زبان لکھنے والوں کو وہ اُردو کا دشمن کہتے تھے اور آسان زبان لکھنے پر زور دیتے تھے۔اُردو ادب میں قدیم کتابوں کی تدوین، ترتیب اور اشاعت اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ان کتابوں پر اُن کے مقدمات اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔انگریزی اُردو لغت اور اُردو زبان کی قواعد کا بنیادی کام بھی مولوی عبدالحق کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

© NCERT not to be republished

5012CH08

مخلوط زبان

اردو پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ مخلوط زبان ہے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ ٹھیٹ ہندوستانی زبان ہے۔ اب رہی یہ بات کہ یہ مخلوط ہے تو مخلوط ہونا کوئی عیب نہیں بلکہ ایک اعتبار سے خوبی ہے۔

یوں تو دنیا میں کوئی زبان خالص نہیں ہر زبان نے کسی نہ کسی زمانے میں دوسری زبانوں سے کچھ نہ کچھ لفظ لیے ہیں یہاں تک کہ جو زبانیں مقدس کہلاتی ہیں وہ بھی اچھوتی نہیں ...... مخلوط زبان میں ہوتا یہ ہے کہ غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنی پڑتی ہے مخلوط نہیں ہوتی بلکہ اس کی اپنی زبان غیر زبان کے میل سے مخلوط ہوجاتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال مسلمانوں کے آنے کے بعد ہوا، فارسی مخلوط نہیں ہوئی بلکہ مقامی زبان فارسی سے مخلوط ہوکر ایک نئی زبان بن گئی ہے۔

یہ بھی ایک مسلّم ثبوت ہے کہ غیر زبان کے لفظ جو کسی زبان میں داخل ہوجاتے ہیں یا کسی زبان کو مخلوط کرتے ہیں تو اصلی زبان کے صرف ونحو کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ یہی صورت اس مخلوط زبان اردو میں پیش آئی کہ فارسی کا اثر اسماء وصفات تک رہا البتہ بعض حروف عطف مثلاً اگر، مگر، اگرچہ، لیکن وغیرہ آگئے اصل صرف ونحو بالکل دیسی زبان کی رہی اور جب ضرورت پڑی فارسی، عربی، لفظوں کو ہندی قالب میں ڈھال کر اپنا لیا۔ مثلاً عربی الفاظ بدل، کفن، دفن، قبول سے بدلنا، کفنانا، دفنانا، قبولنا، مصدر بنا لیے۔ اسی طرح فارسی سے بخشنا، فرمانا، نوازنا، داغنا وغیرہ بنا لیے گئے یہ سب اردو ہوگئے فارسی، عربی نہیں رہے......

بدیسی لفظوں سے زبان خراب نہیں ہوتی بلکہ برخلاف اس کے اس میں وسعت، قوت اور شان پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے غیر ضروری الفاظ بھی باہر سے آکر داخل ہوجاتے ہیں۔ غیر ضروری سے میری مراد ان لفظوں سے ہے جن کے ہم معنی لفظ پہلے سے زبان میں موجود ہیں۔ لیکن مترادف الفاظ سے کوئی نقصان نہیں بلکہ زبان میں اضافہ ہوجاتا ہے اور زبان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ایک مدت کے استعمال کے بعد مترادف الفاظ کے مفہوم میں خود بخود ایسے نازک فرق پیدا ہوجاتے ہیں جس سے زبان کی لطافت بڑھ جاتی ہے اور جو لفظ پہلے غیر ضروری سمجھے جاتے تھے ضروری ہوجاتے ہیں۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ بدیسی الفاظ سے زبان بوجھل اور بھدی ہوجاتی ہے۔ وہ لفظ جو غیر زبان سے آکر داخل ہوجاتے ہیں وہ اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ زبان میں پوری طرح کھپ جاتے ہیں اور ان کی اجنبیت بالکل جاتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ

© NCERT not to be republished

زبان پر بار نہیں ہوتے۔ بلکہ ان میں اور دیسی لفظوں میں آسانی اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔

انسانی خیال کی کوئی تھاہ نہیں اور نہ اس کے تنوع اور وسعت کی کوئی حد ہے۔ زبان کیسی ہی وسیع اور بھرپور ہو، خیال کی گہرائیوں اور باریکیوں اور نازک حرفوں کو صحت کے ساتھ ادا کرنے میں قاصر رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ادا کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے جاتے ہیں۔ مترادف الفاظ ایسے موقعوں پر بہت کام آتے ہیں۔ مترادف الفاظ سب ہم معنی نہیں ہوتے۔ ان کے مفہوم اور استعمال میں کچھ نہ کچھ ضرور فرق ہوتا ہے۔ اس لیے ادائے مطالب میں ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے خاص کر شاعری کے اغراض کے لیے مترادف الفاظ کا کثرت سے ہونا بہت کام آتا ہے۔ شاعر ان کے ذریعہ سے لطیف سے لطیف خیال اور نازک سے نازک جذبات کو ادا کر سکتا ہے، پھر اس سے ردیف وقافیے کے لیے بہت سہولت ہو جاتی ہے۔

ادیب اور شاعر کے لیے لفظ کا انتخاب بڑی اہمیت اور قدر و قیمت رکھتا ہے۔ ایک برمحل صحیح لفظ کا انتخاب کلام میں جان ڈال دیتا ہے۔ مخلوط زبان میں انتخاب کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ ذوقؔ کا شعر ہے ؎

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

خاصا شعر ہے مگر کوئی خاص بات نہیں۔ میر تقی میرؔ اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

یہاں "کھپا جانا" کے لفظ نے کیا کام کیا ہے! کوئی دوسرا لفظ رکھ کر دیکھیے یہ بات نہیں آئے گی۔ اسی شعر میں لذت اور مزہ دو مترادف لفظ ہیں۔ اگر ایک ہی لفظ دونوں جگہ استعمال ہوتا تو شعر سست اور بے مزہ ہو جاتا ہے۔

محبت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ
سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا

ہماری زبان میں مرض، بیماری، روگ، عارضہ مترادف ہیں لیکن ایک سچا شاعر یا ادیب خوب سمجھتا ہے کہ کون لفظ کہاں استعمال کرنا چاہیے۔ اسی شعر میں جی کے ساتھ "روگ" کی جگہ "مرض" یا بیمار یہ لطف نہ دے گا۔

غرض فارسی کے میل سے ہماری لغت میں بے بہا اضافہ ہوا ہے۔ الفاظ کے ساتھ ساتھ خیالات بھی آجاتے ہیں۔ صرف

© NCERT not to be republished

لفظوں کا ذخیرہ کوئی چیز نہیں۔ بڑی چیز ان کا استعمال ہے جو خیال کے صحیح طور پر ادا کرنے، مترادفات کے نازک فرق، خیالات میں صفائی اور صحت بیان پیدا کرنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اور یہ نہ بھی ہو تو ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بار بار ایک لفظ کے اعادے سے جو بیان میں بھدّا پن آجاتا ہے وہ رفع ہوجاتا ہے اور کلام میں حسن پیدا ہوجاتا ہے۔

اگر زبان کی قدر و منزلت ان مقاصد کے پورا کرنے میں ہے جن کے لیے زبان بنی ہے تو ہمیں اس امر کو ماننا پڑے گا کہ غیر زبان کے الفاظ داخل ہونے سے ہماری زبان کو بے انتہا فائدہ پہنچتا ہے۔ عوام کی زبان یعنی کھڑی بولی جس پر اردو کی بنیاد ہے اس قدر محدود تھی کہ اگر اس میں فارسی عنصر شریک نہ ہوتا تو وہ کبھی علم و ادب کے کوچے سے آشنا نہ ہوتی اور اس وقت جو اردو میں اظہارِ خیال کے نئے ڈھنگ پیدا ہوگئے ہیں وہ ان سے محروم رہتی۔

اردو میں ہندی اور فارسی لفظ مل جل کر شیر و شکر ہوگئے ہیں اور عام بول چال محاوروں اور کہاوتوں میں بے تکلف آگئے ہیں، مثلاً تم کس باغ کی مولی ہو، اشرفیاں لٹیں اور کولوں پر مہر، ایک آنکھ میں شہد ایک آنکھ میں زہر، لاکھ کا گھر خاک ہوگیا، اللہ کا دیا سر پر، خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں، بدا چھا بدنام برا، بدن پر نہیں لتّا پان کھائیں البتہ وغیرہ وغیرہ سیکڑوں کہاوتیں ہیں۔ یہی حال محاوروں کا ہے۔ مثلاً آنکھوں میں خار لگنا، خدا لگتی کہنا، آنکھوں پر پردہ پڑ جانا، لہو لگا کے شہیدوں میں ملنا، اللہ میاں کی گائے ہونا۔

مخلوط زبان میں ایک آسانی مرکب الفاظ کے بنانے میں بھی ہوتی ہے۔ دیکھیے ہندی فارسی کے میل سے کیسے اچھے اچھے مرکب لفظ بن گئے ہیں، مثلاً دل لگی، نیک چلن، جگت استاد، بھتیج داماد، گھر داماد، سمجھدار، گنڈے دار، اگالدان، عجائب گھر، کفن چور، جیب گھڑی، امام باڑہ، منھ زور وغیرہ ہزاروں مرکبات ہیں۔

مخلوط زبانوں کے بننے کے دوران میں ایک اور بات بھی عمل میں آتی ہے جو قابلِ غور ہے۔ یعنی ان میں سے ہر زبان کو اس خیال سے جانیں کہ ایک دوسرے کی بات آسانی سے اور جلد سمجھ میں آجائے۔ اپنی بعض خصوصیات ترک کرنی پڑتی ہیں اور صرف ایسی صورت باقی رکھنی پڑتی ہے جو یا تو مشترک ہوتی ہیں یا جن کا اختیار کرنا دونوں کے لیے سہل ہوتا ہے اور اس طرح دونوں میں توازن سا پیدا ہوجاتا ہے۔ جو فریقین کے لیے سہولت کا باعث ہوتا ہے۔ اردو کے بننے میں بھی یہی ہوا۔ فریقین یعنی ہندو و مسلمان دونوں نے اپنی اپنی زبانوں میں کتر بیونت کی۔ اپنی مخصوص خصوصیات ترک کیں اور اس قربانی کے بعد جو زبان بنی اسے اختیار کرلیا، جو اب بھی ہماری ملکی اور قومی زبان ہے اور ہندوستان کی مشترک اور عام زبان ہونے کا درجہ حاصل کرچکی ہے، ہم نے اسے قربانی دے کر حاصل کیا ہے، اور کسی کا منھ نہیں ہوسکتا کہ ہم سے چھڑا لے۔

ایک حکیم کا قول ہے کہ غیر اقوام کے لوگوں کو اپنی قوم میں اس طرح جذب کرلینا کہ اپنے اور غیر میں امتیاز نہ رہے، بلاشبہ

© NCERT not to be republished

مشکل کام ہے لیکن غیر زبان کے الفاظ کو اپنی زبان میں اس طرح جذب کر لینا کہ معلوم تک نہ ہو کہ یہ غیر ہیں اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ یہ استعداد اردو میں بہ درجہ کمال موجود ہے اس میں سیکڑوں ہزاروں لفظ غیر زبانوں کے اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ بولنے اور پڑھنے والوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ دیسی ہیں یا بدیسی، اپنے ہیں یا پرائے۔

غرض ہماری زبان ایک خوش رنگ اور ہرا بھرا گلدستہ ہے جس میں رنگ برنگ کے خوبصورت پھول اور نازک پتیاں ہیں۔ کیا ہم اس وہم سے کہ اس میں گلاب بدیسی ہے اور کچھ پتیاں باہر کے پودوں کی ہیں انہیں نوچ کر پھینک دیں گے؟ اگر کوئی ایسا کرے تو سراسر نادانی ہے۔

مجھے سر تیج بہادر سپرو کے اس قول سے حرف بہ حرف اتفاق ہے کہ ''یہی زبان جسے ہم اردو کہتے ہیں، تنہا وسیلہ ہے جس سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب کو سمجھ سکتے ہیں یہی وہ ذریعہ ہے جس سے ہندو مسلمان میں اتحاد پیدا کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہوسکتی کہ اس زبان کو مٹانے اور اس رشتے کو توڑنے کی کوشش کی جائے۔'' (تلخیص)

—— مولوی عبدالحق

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ ومعنی:

مخلوط	:	مِلا جُلا، ملی جلی
مقدس	:	پاک
بعینہٖ	:	بالکل وہی، ویسی ہی
بلا تامل	:	بلا جھجک
صرف ونحو	:	لفظ اور جملے کے قواعد
ہاتھ نہ لگانا	:	مدد نہ کرنا، ساتھ نہ دینا

اسما	:	اسم کی جمع ، نام
صفات	:	صفت کی جمع ، خصوصیات
قالب	:	جسم ، پیکر
وسعت	:	پھیلاؤ
لطافت	:	جولطیف ہونے کا احساس پیدا کرے
تھاہ	:	گہرائی
تنوع	:	رنگا رنگی
لطیف	:	جولطف دے سکے
مفہوم	:	معنی ، مطلب
قاصر	:	بے بس ، مجبور
بَرمحل	:	بروقت ، مناسب موقع پر ، وقت پر
بے بہا	:	بہت قیمتی ، انمول
صحت بیان	:	بیان کا صحیح ہونا
اعادہ	:	دہرانا
رفع کرنا	:	دور کرنا
قدر ومنزلت	:	عزّت واحترام
شیروشکر ہونا	:	گھل مل جانا
جذب کرنا	:	سمو لینا
بہ درجہ کمال	:	بہت بلند درجے پر
وسیلہ	:	ذریعہ ، واسطہ

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- مولوی عبدالحق کے اس مضمون سے اردو زبان کی بنیادی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔
- اردو زبان کی سب سے بڑی خوبی اس کی وسعت ہے۔ اس میں غیرزبانوں کے بہت سے الفاظ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ بولنے اور پڑھنے والوں کو احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ اندازہ لگانا ہمارے لیے مشکل ہوجاتا ہے کہ کون سے الفاظ دیسی ہیں اور کون سے الفاظ بدیسی۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ مخلوط زبان سے کیا مراد ہے؟ وضاحت کیجیے۔
2۔ زبان میں 'بدیسی الفاظ' داخل ہونے کے کیا فائدے بیان کیے گئے ہیں؟
3۔ اس مضمون میں اردو زبان کی کن خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے؟

عملی کام:

- ذیل میں دیے گئے الفاظ اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

  مخلوط   مترادف   قدر و منزلت   بے بہا
- سبق میں جو محاورے اور کہاوتیں بیان کی گئی ہیں ان کی فہرست بنائیے۔
- اس مضمون میں سر تیج بہادر سپرو نے اردو زبان کے بارے میں جو کہا ہے اسے اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

© NCERT not to be republished

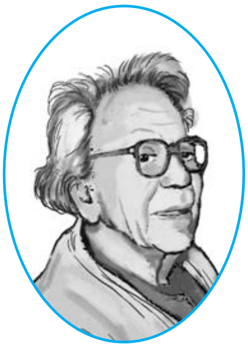

آلِ احمد سُرور

(1911 – 2002)

آلِ احمد نام، سُرور تخلص، بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سینٹ جونس کالج، آگرہ سے بی۔ایس۔سی اور علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی سے پہلے انگریزی اور پھر اردو میں ایم۔اے کیا۔ 1934 میں علی گڑھ میں انگریزی کے اور 1936 میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ ایک سال رضا کالج، رامپور کے پرنسپل بھی رہے۔ بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1955 میں پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی واپس آگئے۔ 1958 سے ریٹائرمنٹ تک اسی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے پروفیسر اور صدر کے فرائض انجام دیے۔ سرور صاحب 18 برس تک انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ انھوں نے 'ہماری زبان' اور 'اُردو ادب' کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

آلِ احمد سرور اردو زبان کے صاحب طرز ادیب اور ممتاز نقّاد تھے۔ تنقید جیسے موضوع کو انھوں نے اپنی دل کش تحریر کے ذریعہ ایک پسندیدہ اور شائستہ فن بنا دیا۔ سرور صاحب کی تصانیف میں ''تنقیدی اشارے''، ''نئے اور پرانے چراغ''، ''تنقید کیا ہے''، ''ادب اور نظریہ''، ''مسرت سے بصیرت تک'' قابل ذکر ہیں۔ ''سلسبیل''، ''ذوقِ جنوں'' اور ''خواب اور خلش'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ''خواب باقی ہیں'' سرُور صاحب کی آپ بیتی ہے۔ مضمون ''چکبست لکھنوی'' سرور صاحب کی ریڈیائی تقریروں کے مجموعے ''تنقیدی اشارے'' سے ماخوذ ہے۔

© NCERT not to be republished

5012CH09

چکبستؔ لکھنوی

چکبستؔ 1882 میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن لکھنؤ تھا، اس لیے وہیں چلے آئے اور تعلیم وہیں حاصل کی۔ شعروادب کا ذوق گھٹّی میں پڑا تھا اور لکھنوی مذاق رگ رگ میں رچا ہوا تھا۔1905 میں کیننگ کالج سے بی۔اے، ایل۔ایل۔بی کرنے کے بعد آپ نے وکالت شروع کی اور اس پیشہ میں آپ کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔1926 میں جب آپ کی عمر تقریباً پینتالیس سال کی تھی اچانک انتقال کیا۔کاظم حسین محشر نے آپ ہی کے مصرعے سے تاریخ نکالی:

ان کے ہی مصرعے سے تاریخ ہے ہمراہِ عزا
''موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا''

چکبستؔ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ سرعت سے بدل رہا تھا۔ ایک طرف قدامت کا رنگ تھا، جو ابھی سماج پر چھایا ہوا تھا، اور دوسری طرف نئی تہذیب کی بڑھتی اور چڑھتی ہوئی روشنی تھی جو آہستہ آہستہ اپنا اثر جما رہی تھی۔اس ماحول میں طبائع زیادہ مشتعل اور معیار زیادہ سخت تھے۔کچھ لوگ قدامت پرست تھے، کچھ ایک نئی دنیا کے خواب دیکھ رہے تھے۔کچھ ایسے بھی تھے جو تھوڑی سی اصلاح، تھوڑی سی تبدیلی، تھوڑی سی رفوگری کے قائل تھے۔چکبستؔ اس آخری طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔اقبالؔ کی زبان میں ان کا قلب ''مومن'' اور دماغ ''کافر'' تھا۔وہ لکھنؤ کی تہذیب، تمدّن، معاشرت اور اخلاق کے دلدادہ تھے، مگر اس کے ساتھ زمانے کا رخ دیکھ کر اور روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اصلاح وترمیم کے بھی حامی تھے۔وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر، اچھے نقّاد اور اچھے اہل قلم تھے، بلکہ اچھے انسان بھی تھے۔وہ اس طبقے سے تعلّق رکھتے تھے جو صرف عزّت وآرام کی زندگی گزارنے پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ قوم کی بہبود اور بہتری کے لیے نہایت نیک خیالات بھی دل میں رکھتا ہے۔یہ نیک خیالات قدرتی طور پر مُعتدِل اور صلح پسند خیالات ہوتے ہیں۔

چکبستؔ جدید دور کے شعرا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ان کا مجموعۂ کلام ''صبحِ وطن'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ہمارے شعرا اپنے دواوین کے تاریخی نام رکھنے میں اس قدر محو رہتے ہیں کہ کلام کی خصوصیت سے اسے کوئی علاقہ نہیں رہتا۔ایک صاحب اپنے دیوان کو ''بیاضِ فطرت'' کہتے ہیں، حالاں کہ صحیح نام ''شیاما سے دو دو باتیں'' ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ اس

میں بسم اللہ سے تمّت تک شیاما جلوہ گر ہیں۔خیر تو ''صبحِ وطن'' چکبستؔ کے رجحان کا صحیح پتہ دیتی ہے، کیوں کہ وطن کی محبت چکبستؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔کتاب کے پہلے حصّے میں جو نظمیں ہیں وہ تمام تر وطن اور حُبِ وطن سے متعلق ہیں۔ان میں سے بعض نظمیں سیدھی، صاف اور سہل زبان میں لکھی گئی ہیں ۔ وہ نہایت پُر اثر اور کافی مشہور ہو چکی ہیں ''ہمارا وطن دل سے پیارا وطن'' اور ''وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک'' سے شاید ہی کوئی شخص نا آشنا ہو۔ایک دوسری نظم ''خاکِ ہند'' میں ہندوستان کی قدیم عظمت اور اس کے مشاہیر کا ذکر کس محبت سے کرتے ہیں ۔

دیوارو در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فُغاں ہے
فردوس گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنّت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

قوم کی آزادی سے متعلق چکبستؔ کا نظریہ ہمارے لبرَل سیاست دانوں کے تصّور سے ملتا جلتا ہے۔''آوازۂ قوم'' میں فرماتے ہیں ۔

یہ آرزو ہے کہ مہروفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح وشام رہے
نہ کوئی مرُغِ خوش اِلحاں اسیرِ دام رہے
سریرِ شاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہے چمن کا مُحافظ یہ تاجدارِ چمن

ہندوستانی سپاہیوں کی فوج، دولتِ برطانیہ کی جانب سے، یورپ کی جنگ میں شرکت کے لیے جاتی ہے۔چکبستؔ انھیں یوں بڑھاوا دیتے ہیں۔خدا انیسؔ اور دبیرؔ کی تُربت کو عنبریں کرے! ان کے بعد بھی ان کے رنگ کے نام لیوا باقی رہے۔

© NCERT not to be republished

ساحلِ ہند سے جرّارِ وطن جاتے ہیں　　کچھ نئی شان سے جانبازِ کُہن جاتے ہیں
رَن میں باندھے ہوئے شمشیروکفن جاتے ہیں　　تیغ زن، برق فِگن، قلعہ شِکن جاتے ہیں
سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سائے میں قضا چلتی ہے

''صبحِ وطن'' کے دوسرے حصّہ میں زیادہ تر اصلاحی و مذہبی نظمیں ہیں۔اس میں بھی زیادہ تر مسدّس میں لکھی گئی ہیں اور چکبستؔ نے اس صنفِ سخن کو کامیابی سے نبایا ہے۔

ایک جگہ نوجوان سے خطاب ہوتا ہے ؎

چمنِ عمر ہمیشہ نہ رہے گا شاداب　　خُم میں باقی نہ رہے گی یہ جوانی کی شراب
نشّۂ علم میں ہر وقت رہو تم غرقاب　　شانِ تعلیم یہی ہے، یہی تہذیب شباب
لے اُڑے دل کو، طبیعت کی روانی وہ ہے
بے پیے نشہ رہے جس میں، جوانی وہ ہے

''گائے'' پر ایک اچھی نظم لکھی ہے۔اپنی عقیدت کی وجہ بیان کرتے ہیں۔''دودھ سے تیرے لڑکپن میں زباں دھوئی ہے'' ایک بند ملاحظہ ہو ؎

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں　　چشمۂ فیضِ خدا، مردِ خدا کہتے ہیں
درد مندوں کی مسیحا، شعرا کہتے ہیں　　ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں
کون ہے جس نے ترے دودھ سے منھ پھیرا ہے
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہوٗ تیرا ہے

سب سے دل چسپ نظم ''لڑکیوں سے خطاب'' لکھی ہے۔چکبستؔ عورتوں کی آزادی کے بارے میں ''حدِّ ادب'' کے قائل تھے۔بچپن میں جو کہانیاں سنتے تھے، ان سب میں ایک چیز مُشترک ہوتی تھی۔ہیرو کو اُس کی بہن یا ماں تین طرف جانے کی اجازت دیتی تھی اور چوتھی طرف کے لیے منع کرتی تھی۔نتیجہ ہمیشہ یکساں نکلتا تھا۔ہر شخص چوتھی سمت کو دوڑتا تھا۔کہیں ہماری لڑکیوں اور عورتوں کا بھی یہی حشر نہ ہو۔بہرحال نظم کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز ۔۔۔ داغ، تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں ۔۔۔ ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
رُخ سے پردے کو ہٹایا تو بہت خوب کیا ۔۔۔ پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز
دل تمھارا ہے وفاؤں کی پرستش کے لیے ۔۔۔ اس محبت کے شِوالے کو نہ ڈھانا ہرگز
اپنے بچّوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں ۔۔۔ یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
ہم تمھیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

کسی زبان کی شاعری صرف غِنائیات (گیتوں اور غزلوں) سے مالا مال نہیں ہوتی۔اس میں قدیم مذہبی اور نیم مذہبی داستانوں کی بھی ضرورت ہے۔بڑے افسوس کی بات ہے کہ ''رامائن'' اور ''مہابھارت'' کی داستانیں ابھی اردو میں صرف تبرک کے طور پر ملتی ہیں۔چکبستؔ نے رامائن کا ایک سین کھینچا ہے۔جس کو پڑھ کر ان کی اس صِنف میں قادرالکلامی معلوم ہوتی ہے۔وہ اس کام کے لیے نہایت موزوں تھے۔ماں کے دل کا اِضطراب اور رام چندر جی کے بن باس پر پریشانی کا حال یوں بیان ہوتا ہے ؎

ایسے بھی نامُراد بہت آئیں گے نظر ۔۔۔ گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنّا جو بے ثمر ۔۔۔ یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنّا اُجڑ گیا

رام چندر جی کا جواب بھی ان کی بلند سیرت اور توکُّل کے شایانِ شان ہے۔

اپنی نگاہ ہے کرمِ کار ساز پر ۔۔۔ صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر ۔۔۔ رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اُس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

تیسرے حصّے میں بیشتر مراثی ہیں۔یہ مرثیے صرف غم کی داستانیں نہیں ہیں ان میں چکبستؔ نے سیرت نگاری کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیے ہیں۔گوکھلے اور تلک کے گرد صرف آنسوؤں کا سیلاب ہی نہیں، یہ زندہ اور تابندہ بھی نظر آتے ہیں۔اس

© NCERT not to be republished

طرح یہ نظمیں صرف وقتی نہیں رہتیں بلکہ لازوال ہوجاتی ہیں۔ایک رہنمائے قوم کے ماتم میں لکھتے ہیں۔

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ　　سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چُنے رِفاہ کے گُل حُسنِ انتخاب کے ساتھ　　شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ
جو آج نشو ونما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

چکبستؔ کی غزلوں میں بھی ان کا پیامی رنگ جھلکتا ہے۔بعض تنگ نظر ممکن ہے انھیں غزل کے حدود سے خارج کردیں، کیوں کہ انھیں مشکل سے کوئی شعر مُعاملہ بندی اور زلفِ گرہ گیر کی مدح میں ملے گا۔ہاں ''بادہ وساغر'' اور ''دشنہ وخنجر'' قسم کے بہت سے شعر نظر آئیں گے۔

فنا نہیں ہے محبت کے رنگ و بُو کے لیے
بہارِ عالم فانی رہے، رہے نہ رہے
جنونِ حُبِّ وطن کا مزا شباب میں ہے
لہُو میں پھر یہ روانی رہے، رہے نہ رہے
جو مانگنا ہو ابھی مانگ لو وطن کے لیے
یہ آرزو کی جوانی رہے، رہے نہ رہے

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے
ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنھا نہیں سکتے

© NCERT not to be republished

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

نفاق، گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بُت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خُمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا
وہی قطرہ لہُو کا اشک بن کر گرگیا رُسوا
جسے ہم نے نمک پروردۂ زخمِ جگر جانا

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریکِ درد وغم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میرا
لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

اس شعر کی داد دینے کے لیے اقبال کا اسی مضمون کا شعر سُنیے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اور اصغر بھی اس میدان میں پیچھے نہیں ؎

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عِصیاں کو

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو میری طرح
اس کے لیے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

© NCERT not to be republished

ہوگیا ہوں ساری دنیا کے گناہوں میں شریک
جب سے میں نے یہ سُنا ہے اس کی رحمت عام ہے

ہمارے اساتذہ میں کلام کی خوبی کا معیار مشق کی کثرت اور سلسلے کی عظمت تھا۔ چنانچہ ایک صاحب کا یہ شعر آپ نے سُنا ہوگا۔

شاعری کھیل نہیں ہے جسے لڑکا کھیلے
ہم نے پچپن برس اس فن میں ہیں پاپڑ بیلے

غریب چکبستؔ اس معیار کے مطابق شاید طفلِ شیر خوار ہی ٹھہرا، وہ جوانی ہی میں اس دنیا سے رُخصت ہوا اور اس نے زیادہ تر اپنی طبع رسا کو رہبر بنایا۔ وہ بہ قولِ خود تخلّص کا بھی دنیا میں گنہگار نہ تھا، ہاں اس میں شاعری کا فطری ذوق تھا، ایک حساس طبیعت تھی اور اُس کے اندازِ بیان میں ایک رعنائی اور رنگینی تھی۔ ہمارا جدید اردو ادب اسی رنگینی سے باغ و بہار بنا ہوا ہے۔

—— آل احمد سرورؔ

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

طبائع	:	طبع کی جمع، طبیعتیں
ترمیم	:	کاٹ چھانٹ، ردّ و بدل
بہبود	:	بہتری، بھلائی
بسم اللہ سے تمّت تک	:	شروع سے اخیر تک
مشاہیر	:	مشہور کی جمع، مشہور لوگ
فغاں	:	آہ و زاری
فردوس گوش	:	کانوں کو خوش گوار یا اچھی لگنے والی آواز

عیاں	:	ظاہر،نمایاں
لبرل (Liberal)	:	آزادخیال،روادار
اسیرِدام	:	جال میں پھنسا ہوا
سریر	:	تخت
اقبال	:	بلندی
تربت کوعنبریں کرنا	:	قبرکوعنبر کی خوشبو سے بھر دینا
جرّار	:	بہادر
تیغ زن	:	تلوار چلانے والا
برق فگن	:	بجلیاں گرانے والا
قلعہ شکن	:	مراد قلعہ فتح کرنے والا
ظفر	:	فتح
خُم	:	شراب کا مٹکا
روشِ خام	:	غلط راستہ
قادرالکلامی	:	قدرتِ کلام
توکّل	:	بھروسہ(خداپر)،قناعت
کارساز	:	کاموں کو بنانے والا مراد خدا
حضر	:	سفر کی ضد، قیام
رفاہ	:	بھلائی
معاملہ بندی	:	شعر میں ایسی باتوں اور معاملات کا بیان جو عاشق اور اس کے محبوب کے درمیان ہوتے ہیں
زلف گرہ گیر	:	بل کھائی ہوئی یا الجھی ہوئی زلف

© NCERT not to be republished

دشنہ	:	خنجر، کٹاری
گبر	:	آتش پرست، مراد کافر
فردِ عصیاں	:	گناہوں کی فہرست
عرقِ انفعال	:	شرمندگی کے باعث آنے والا پسینہ
متاع	:	پونجی
طفلِ شیر خوار	:	دودھ پیتا بچہ
طبعِ رسا	:	تیز ذہن

غور کرنے کی بات:

- اس مضمون کے مطالعے سے چکبست ایک محبِّ وطن شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں اس کے علاوہ ان کی شاعری میں اصلاحی پہلو بھی ہیں اور کہیں کہیں فلسفیانہ مضامین بھی شامل ہیں۔

© NCERT not to be republished

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ چکبستؔ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ ماحول کیا تھا؟
2۔ چکبستؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟
3۔ اس مضمون میں شامل اشعار میں چکبستؔ، اقبالؔ اور اصغرؔ تینوں نے کس خیال کو پیش کیا ہے؟ تحریر کیجیے۔
4۔ مسدّس کسے کہتے ہیں؟

عملی کام:

- مندرجہ ذیل کے واحد لکھیے۔

دواوین طبائع مشاہیر مراثی

ابن انشا

(1927 – 1979)

اصل نام شیر محمد خاں اور قلمی نام ابن انشا تھا۔ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ 1947 میں اپنے خاندان کے ساتھ لاہور (پاکستان) آ گئے۔ 1952 میں کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ابتدا میں روزنامہ امروز، لاہور میں فکاہیہ کالم تحریر کیے۔ بعد میں روزنامہ جنگ کراچی اور اخبار جبل میں بھی کالم لکھے۔ شاعر اور مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت ملی۔ ابن انشا اردو اور فارسی کے الفاظ کے ساتھ محاورہ، روزمرہ اور انگریزی الفاظ کا استعمال اس برجستگی سے کرتے ہیں کہ طنز و مزاح کے ساتھ تحریر میں ادبی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

''آوارہ گرد کی ڈائری''، ''دنیا گول ہے''، ''چلنا ہو تو چین کو چلیے''، ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں'' دلچسپ سفرنامے ہیں۔ ''قصہ ایک کنوارے کا''، ''اردو کی آخری کتاب'' اور ''خمار گندم'' وغیرہ ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔

1955 میں ان کا شعری مجموعہ ''چاند نگر'' منظر عام پر آیا۔ ابن انشا نے بچوں کے لیے نظمیں بھی لکھیں ''بلو کا بستہ'' کے عنوان سے ان نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

مضمون ''اشتہارات ضرورت نہیں ہے کے'' ابن انشا کی کتاب ''خمارِ گندم'' سے ماخوذ ہے۔

© NCERT not to be republished

اشتہارات ’ضرورت نہیں ہے‘ کے

ایک بزرگ اپنے نوکر کو فہمائش کر رہے تھے کہ تم بالکل گھامڑ ہو۔ دیکھو میر صاحب کا نوکر ہے اتنا دور اندیش کہ میر صاحب نے بازار سے بجلی کا بلب منگایا تو اس کے ساتھ ہی ایک بوتل مٹی کے تیل کی اور دو موم بتیاں بھی لے آیا کہ بلب فیوز ہو جائے تو لالٹین سے کام چل سکتا ہے۔ اس کی چمنی ٹوٹ جائے یا بتی ختم ہو جائے تو موم بتی روشن کی جا سکتی ہے۔ تم کو ٹیکسی لینے بھیجا تھا تم آدھے گھنٹے بعد ہاتھ لٹکاتے آ گئے۔ کہا کہ جی ٹیکسی تو ملتی نہیں۔ موٹر رکشا کہیے تو لیتا آؤں۔ میر صاحب کا نوکر ہوتا تو موٹر رکشا لے کے آیا ہوتا تاکہ دوبارہ جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

نوکر بہت شرمندہ ہوا اور آقا کی بات پلے باندھ لی۔ چند دن بعد اتفاق سے آقا پر بخار کا حملہ ہوا تو انھوں نے اسے حکیم صاحب کو لانے کے لیے بھیجا۔ تھوڑی دیر میں حکیم صاحب تشریف لائے۔ تو ان کے پیچھے پیچھے تین آدمی اور تھے جو سلام کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ایک کی بغل میں کپڑے کا تھان تھا، دوسرے کے ہاتھ میں لوٹا، اور تیسرے کے کاندھے پر پھاوڑا۔ آقا نے نوکر سے کہا۔ یہ کون لوگ ہیں میاں۔ نوکر نے تعارف کرایا کہ جناب ویسے تو حکیم صاحب بہت حاذق ہیں۔ لیکن اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو میں درزی کو لے آیا ہوں اور وہ کفن کا کپڑا ساتھ لایا ہے۔ یہ دوسرے صاحب غسال ہیں اور تیسرے گورکن۔ ایک ساتھ اس لیے لایا کہ بار بار بھاگنا نہ پڑے۔

ایسے ہی ایک بزرگ ہمارے حلقے میں بھی ہیں۔ گلی سے ریڑھی والا ہانک لگاتا گزر رہا تھا کہ انگور ہیں چمن کے، پپیتے ہیں پیڑ کے پکے ہوئے۔ انھوں نے لڑکا بھیج کر انھیں بلایا اور کہا ”میاں جی معاف کیجیے ہمیں ضرورت نہیں۔ پھل والا چلا گیا تو ہم نے عرض کیا کہ ”اس زحمت کی کیا ضرورت تھی، وہ تو جا ہی رہا تھا اسے روکنا کیا ضروری تھا۔“ بولے ”احتیاط کا تقاضا تھا کہ اس پر بات واضح کر دی جائے اور معذرت بھی کی جائے کیوں کہ بیچارہ اتنی دور سے اتنی امید لے کر پھل بیچنے آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے یہ گمان نہ گزرے کہ اس گھر میں شاید بہرے رہتے ہیں جو اس کی آواز نہیں سن پاتے۔“ یہی ہمارے دوست ایک روز کار میں ہمارے ساتھ گولی مار سے گزر رہے تھے ایک جگہ لکھا ہے تشریف لائیے۔ ربڑی، قلفی اور لسّی تیار ہے۔ انھوں نے فوراً کار ٹھہرائی اور دوکاندار

© NCERT not to be republished

سے کہا کہ ''پہلی بات تو یہ کہ ہمارے پاس فرصت نہیں ۔ہم ضروری کام سے جارہے ہیں ۔دوسرے قلفی اور ربڑی ہم نہیں کھاتے اور لسّی کا بھلا یہ کون سا موسم ہے؟ بہر حال تمھاری پیش کش کا شکریہ''۔ وہ تو بیٹھا سنا کیا اور نہ جانے کیا سمجھا کیا۔کار میں واپس بیٹھے ہوئے ہمارے دوست نے وضاحت کی کہ یہاں کے لوگ ان آداب کو کیا جانیں ۔ یہاں تو دعوت نامہ آتا ہے اور اس کے نیچے RSVP لکھا ہوتا ہے کہ جواب سے مطلع فرمایئے ۔جن کو شریک نہیں ہونا ہوتا وہ بھی چپ بیٹھ رہتے ہیں ۔میزبان کو مطلع کرنا ضروری نہیں سمجھتے کہ بندہ حاضر ہونے سے معذور ہے،اس بیچارے کا کھانا ضائع ہوجاتا ہے۔

ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم خود انھیں آداب سے بے بہرہ لوگوں میں سے ہیں ۔لوگ اخبارات میں طرح طرح کے اشتہارات چھپواتے ہیں کہ ہم پڑھ کر ان کی طرف متوجہ ہوں لیکن ہم پڑھ کر ایک طرف ڈال دیتے ہیں کوئی ہمارے لیے ٹھیکے کا بندوبست کرتا ہے اور ٹینڈر نوٹس شائع کرتا ہے ۔کسی کو ہمارے ہاتھ پلاٹ یا مکان بیچنا ہوتا ہے ۔کوئی ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس نے اپنے نالائق فرزند کو جائداد سے عاق کردیا ہے۔کہیں کسی کی کوشش ہوتی ہے کہ ہم ان کی فرزندی قبول کرلیں اور ذات پات تعلیم اور تنخواہ کی شرطیں من وعن وہی رکھی جاتی ہیں جو ہم میں ہیں۔ کوئی ہمیں گھر بیٹھے لاکھوں روپے کمانے کا لالچ دیتا ہے۔ کوئی شارٹ ہینڈ سکھانے کی کوشش کرتا ہے۔بہت سے کالج مشتاق ہیں کہ ہم ان کے یہاں داخلہ لیں اور بعضے اپنی کاریں اور ریفریجریٹر معقول قیمت پر ہماری نذر کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سب ضرورت مندوں سے آدمی کیسے عہدہ برآ ہو۔بہت سوچنے کے بعد یہ ترکیب ہماری سمجھ میں آئی ہے کہ جہاں ہم کو ضرورت ہے کا اشتہار چھپتا ہے وہاں ہم'' ضرورت نہیں ہے''، کا اشتہار چھپوادیں ۔ ہماری دانست میں ان اشتہارات کی صورت کچھ اس قسم کی ہونی چاہیے۔

کرائے کے لیے خالی نہیں ہے

400 گز پر تین بیڈروم کا ایک ہوا دار بنگلہ نما مکان، جس میں نلکا ہے اور عین دروازے کے آگے کارپوریشن کا کوڑا ڈالنے کا ڈرم بھی۔ کرایے پر دینا مقصود نہیں ہے۔ نہ اس کا کرایہ تین سو روپے ماہوار ہے اور نہ چھ ماہ پیشگی کرایہ کی شرط ہے۔ جن صاحبوں کو کرایے کے مکان کی ضرورت ہو وہ فون نمبر 34567 پر رجوع نہ کریں کیوں کہ اس کا کچھ فائدہ نہیں۔

اطلاع عام

راقم محمد دین ولد فتح دین کریانہ مرچنٹ یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہے کہ اس کا فرزند رحمت اللہ نہ نا فرمان ہے نہ اوباشوں کی صحبت میں رہتا ہے لہٰذا اسے جائداد سے عاق کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آیندہ جو صاحب اسے کوئی ادھار وغیرہ دیں گے وہ میری ذمہ داری پر دیں گے۔

ضرورت نہیں ہے

کار، مارس مائنر، ماڈل 1959ء، بہترین کنڈیشن میں، ایک بے آواز ریڈیو نہایت خوبصورت کیبنٹ، ایک ویسپا موٹر سائکل اور دیگر گھریلو سامان پنکھے، پلنگ وغیرہ قسطوں پر یا بغیر قسطوں کے ہمیں درکار نہیں۔ ہمارے ہاں خدا کے فضل سے یہ سب چیزیں پہلے سے موجود ہیں۔ اوقاتِ ملاقات 3 تا 8 بجے شام۔

عدم ضرورت رشتہ

ایک نوجوان برسرروزگار آمدنی تقریباً پندرہ سو روپے ماہوار کے لیے کسی باسلیقہ، خوبصورت شریف خاندان کی تعلیم یافتہ دوشیزہ کے رشتے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ لڑکا پہلے سے شادی شدہ ہے۔ خط وکتابت صیغۂ راز میں نہیں رہے گی۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار لڑکے اور لڑکیوں کے لیے رشتے مطلوب نہیں ہیں۔ پوسٹ بکس ـ کراچی۔

داخلے جاری نہ رکھیے

کراچی کے اکثر کالج آج کل انٹر اور ڈگری کلاسوں میں داخلے کے لیے اخباروں میں دھڑا دھڑ اشتہار دے رہے ہیں۔ یہ سب اپنا وقت اور پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کے ہاں داخل ہونا مقصود نہیں۔ ہم نے کئی سال پہلے ایم۔ اے پاس کرلیا تھا۔

—— ابن انشا

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

فہمائش	:	سمجھانا، ڈانٹنا، تنبیہ کرنا
دورراندیش	:	بہت سمجھدار، مستقبل پر نگاہ رکھنے والا
آفاق	:	افق کی جمع ، آسمان کے کنارے
حاذق	:	اپنے فن میں ماہر طبیب
غسال	:	میّت کو غسل دینے والا
گورکن	:	قبر کھودنے والا
بے بہرہ	:	نا اہل، نالائق
عاق کرنا	:	حقِ وراثت سے محروم کرنا
مِن وعَن	:	حرف بہ حرف، جوں کا توں
عہدہ برآ ہونا	:	فرض ادا کرنا، کسی کام کو پورا کرنا
برسرِ روزگار	:	ملازمت میں، کام سے لگا ہوا، ایسا شخص جو بے روزگار نہ ہو
صیغۂ راز	:	راز کی بات، وہ بات جو چھپا کر رکھی جائے
مطلوب	:	جو طلب کیا گیا ہو، جس کی خواہش کی گئی ہو، جو مانگا گیا ہو
مقصود	:	مراد، غرض، مدعا

غور کرنے کی بات:

○ یہ مضمون مزاح نگاری کا ایک نمونہ ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ معمولی، عام اور روزمرّہ کی باتوں کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ یہ ہنسی قہقہے کی شکل میں نہیں بلکہ شگفتگی اور مسکراہٹ تک محدود رہتی ہے۔

© NCERT not to be republished

○ ابن انشا کا یہ مضمون بظاہر صرف ہنسانے والا ہے لیکن اس میں طنز کی مدھم آنچ بھی موجود ہے جو سماج میں پھیلی ریا کاری کو ظاہر کرتی ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ نوکر آقا کے علاج کے لیے حکیم صاحب کے ساتھ اور کن لوگوں کو لایا؟

2 اخبارات میں اشتہارات کیوں چھپوائے جاتے ہیں؟

3۔ اطلاعِ عام کے اشتہار میں کیا کہا گیا ہے؟

4۔ مضمون نگار کالج میں داخلہ کیوں نہیں لینا چاہتا؟

عملی کام:

○ اردو کے پانچ مشہور طنز و مزاح نگاروں کے نام لکھیے۔

○ اخبارات میں شائع ہونے والے دلچسپ اشتہارات تلاش کر کے جمع کیجیے۔

○ نیچے دی گئی تصویر کو دیکھیے۔ اس میں دیے گئے اشتہار سے متعلق کلاس میں گفتگو کیجیے۔

© NCERT not to be republished

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز

(1954)

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کا شمار ملک کی اہم تعلیمی اور سائنسی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم دہلی کی معروف درس گاہ اینگلو عربک اسکول اور اعلیٰ تعلیم دہلی یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ نباتیات میں ایم ایس سی، پلانٹ فزیولوجی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین دہلی کالج میں بحیثیت سائنس لیکچرار ملازمت کا آغاز کیا۔ 2005 سے 2015 تک اسی کالج کے پرنسپل رہے۔ اکتوبر 2015 سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے تعلیم اور سائنس کے شعبوں میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ پاپولر سائنس کے فروغ نیز ماحولیات کے تحفظ کے ساتھ اردو زبان میں سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ اسلامک فاؤنڈیشن فار سائنس اینڈ انوائرنمنٹ کے ڈائرکٹر بھی رہے ہیں۔ 1994 سے ماہنامہ ''سائنس'' اردو زبان میں پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ مختلف سائنسی اور ماحولیاتی موضوعات پر ان کی کئی کتابیں اور تقریباً چار سو تحقیقی مضامین ملک اور بیرونِ ملک کے اہم جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

© NCERT not to be republished

5012CH11

ماحول بچائیے

ایک عام آدمی کی نظر میں ماحولیاتی مسئلہ بھی ایک ''سائنسی مسئلہ'' ہے جس پر سائنس داں بحث کرتے رہتے ہیں۔ اس کے خیال میں یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس میں وہ دلچسپی لے یا جس پر غور و فکر کیا جائے۔ لیکن ذرا بتایئے کہ کیا ہم کو اس بات کی فکر نہیں ہے کہ آج کل کینسر کا مرض اتنی شدّت کیوں اختیار کر گیا ہے، دل کے امراض کیوں عام ہو رہے ہیں، لوگوں کو سانس کی تکلیف کیوں ہو رہی ہے، موسموں کا چلن کیوں بگڑ گیا ہے، برسات کی وہ رُتیں اور جھڑیاں کیوں ختم ہو گئی ہیں، دریاؤں کا پانی گدلا اور کنوؤں کا پانی زہریلا کیوں ہو گیا ہے، تازہ ہوا کے وہ جھونکے کہاں چلے گئے کہ جو روح کو شاد کر جایا کرتے تھے، موتی کی طرح شفاف پانی کے وہ قدرتی چشمے کہاں کھو گئے جن کی تہہ کا حال اوپر سے ہی نظر آتا تھا۔ یقیناً یہ ایسے مسائل ہیں کہ جن کا تعلق ہم سے اور ہماری فنا و بقا سے ہے۔ اور اب اگر یہ کہا جائے کہ ان تمام مسئلوں کا سیدھا واسطہ ہمارے بگڑتے ہوئے ماحول سے ہے تو کیا اب بھی آپ ماحولیاتی مسئلے کو محض سائنسی مسئلہ کہیں گے؟

قدرت نے دنیا کی ہر چیز کو ضرورت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ یہاں ہر ایک چیز دوسری چیز کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتی ہے۔ اس آپسی تعلق کو سمجھنے اور سمجھانے کا نام ''ماحولیاتی سائنس'' ہے۔ زمانہ قدیم میں انسان اِس تعلق سے نہ صرف بخوبی واقف تھا بلکہ اس کی زندگی ان قدرتی وسائل کے گرد گھومتی تھی۔ وہ پانی کے ذخیروں کے پاس بستیاں قائم کرتا تھا تاکہ قدرتی پانی اسے حاصل ہوتا رہے۔ جنگلات سے وہ لکڑی، چارہ اور غذا حاصل کرتا تھا۔ زمین وسیع تھی اور آبادیاں کم تھیں۔ رفتہ رفتہ انسانی آبادی بڑھنے لگی تو ان وسائل کی مانگ بڑھی، ان پر دباؤ بڑھا اور ان کے لیے آپس میں لڑائیاں شروع ہوئیں۔ کسی ملک کے زرخیز اور سرسبز و شاداب علاقوں نے وہاں حملہ آوروں کو بلالیا تو کسی ملک کے جانور اور چراگاہیں دشمن کی نظروں میں آگئیں، طاقتور قوتیں اور ممالک کمزوروں کے وسائل پر قابض ہو کر انھیں بے دریغ استعمال کرنے لگے۔ قدرتی وسائل پر دوسرا حملہ صنعتی انقلاب کے دوران ہوا۔ صنعتی انقلاب نے انسان کو مشینوں سے روشناس کرایا۔ مشینوں کی مدد سے اگرچہ پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا اور ایسا ضروری بھی تھا کیوں کہ بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات بڑھتی جا رہی تھیں۔ لیکن اس اضافہ نے خام مال کی مانگ اور بھی بڑھا دی۔ جہاں کاغذ بنانے کے کارخانے لگے تو وہ علاقے جنگلات سے پاک ہو گئے کیونکہ تمام لکڑی کاغذ بنانے کی نذر

© NCERT not to be republished

ہوگئی۔ جہاں کسی دھات سازی کا کام ہوا تو وہاں کان کنی اتنی ہوگئی کہ تمام زمین کھود کھود کر بنجر بنادی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئی نئی ترقیات ہوتی گئیں اور انسانی زندگی پر مشینوں کی گرفت بڑھتی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو قدرتی توازن اس دنیا کے مکینوں کے درمیان تھا، وہ برباد ہوگیا۔

انسان کے اردگرد اس کے اہم ترین ساتھی زمین، ہوا، پانی، جنگلات اور دیگر جاندار ہیں۔ یہی اس کا ماحول کہلاتے ہیں، ان سبھی کا آپس میں ایک دوسرے سے تعلق ہے۔یعنی اگر زمین خراب ہوگئی تو انسان اس سے متاثر ہوگا اور اگر انسان کا رویہ زمین کے تیئں بگڑے گا تو زمین خراب ہوگی۔انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی اور مشینی دور کی آمد نے اس آپسی تعلق کو تہس نہس کردیا۔ کارخانوں اور فیکٹریوں نے نہ صرف یہ کہ خام مال کی شکل میں قدرتی وسائل کو بے تحاشہ استعمال کیا۔ بلکہ ان سے نکلنے والے زہریلے مادّوں نے ہوا، پانی اور زمین کو زہریلا کرنا شروع کردیا۔ کارخانوں کی چمنیوں اور موٹر گاڑیوں سے نکلنے والے دھوئیں اور گیسوں نے ہوا کو آلودہ کردیا۔ جب فیکٹریاں اور گاڑیاں کم تھیں تو کم گیسیں فضا میں خارج ہوتی تھیں اور یہ تھوڑی سی مقدار بہت جلد ہوا میں گھل مل کر اتنی ہلکی ہوجاتی تھی کہ اس کا زہریلا پن ختم ہوجاتا تھا۔لیکن اب صورت حال مختلف ہے، اب اتنی زیادہ مقدار

© NCERT not to be republished

میں یہ گیسیں ہوا میں خارج ہوتی ہیں کہ ان کا پھیلنا اور تحلیل ہونا ناممکن ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ تمام زہریلی گیسیں خطرناک حد تک ہوا میں جمع ہورہی ہیں۔ شہری اور صنعتی علاقوں کے اوپر یہ گیسیں ایک غلاف کی مانند چھائی رہتی ہیں۔ ایسی ہوا میں جب ہم لوگ سانس لیتے ہیں تو یہ سب کیمیائی مادّے ہمارے جسم میں داخل ہوجاتے ہیں۔ ہمارے کارخانوں اور موٹر گاڑیوں سے خارج ہونے والی گیسوں میں زیادہ مقدار کاربن مونو آکسائیڈ، نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ، نائٹرس آکسائیڈ، سلفر ڈائی آکسائیڈ اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی ہوتی ہے۔ ان سبھی گیسوں کی زیادتی ہمارے قدرتی ماحول کے لیے مضر ہے۔ ان میں سے کچھ گیسیں تیزاب کی شکل میں زمین پر آتی ہیں۔ ایسی بارش کو ''تیزابی بارش'' کہا جاتا ہے اور کئی ممالک کو ان بارشوں کا تجربہ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ تیزابی بارش کی سب سے اہم وجہ سلفر ڈائی آکسائیڈ گیس ہے۔ فضا میں اس گیس کی زیادتی خطرے کی گھنٹی ہے۔ کیونکہ تیزابی بارشیں نہ صرف یہ کہ پیڑ پودوں اور جانداروں کو نقصان پہنچاتی ہیں بلکہ ان سے عمارتیں اور دیگر سامان بھی متاثر ہوتا ہے۔

موٹر گاڑیوں سے نکلنے والی کثافت نے نہ صرف ہوا کو ہی متاثر کیا ہے بلکہ کارخانوں کا فضلہ ہوا کے علاوہ پانی اور زمین کو بھی خراب کرتا ہے۔ جب کارخانے کم تھے تو ان کا تھوڑا سا فضلہ پانی میں تحلیل ہوجاتا تھا لیکن جیسے جیسے کارخانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا پانی میں آلودگی بڑھتی گئی۔ آج یہ حال ہے کہ کسی بھی دریا کو ہم پوری طرح صاف اور صحت مند نہیں کہہ سکتے کسی کا پانی سڑ رہا ہے تو کسی کا پانی رنگین ہوگیا ہے، کسی میں گاد بہت ہے تو کسی کے پانی میں تیزابیت اتنی ہے کہ اس میں رہنے والے سبھی جاندار ہلاک ہوچکے ہیں۔

ہوا اور پانی کی کثافت کو قابو میں رکھنے کے لیے قدرت نے بڑا اچھا انتظام کر رکھا ہے۔ زمین کے سینے میں پھیلے ہوئے جنگلات یہ کام بخوبی انجام دیتے ہیں۔ ہوا کی آلودگی کو درخت اور دیگر پودے جذب کرلیتے ہیں نیز ان ہرے جانداروں سے خارج ہونے والی آکسیجن گیس ہوا کے زہریلے پن کو کم بھی

© NCERT not to be republished

کر دیتی ہے۔ تاہم افسوس کی بات یہ ہے کہ جنگلات بھی انسان کی دسترس سے محفوظ نہ رہے۔ کہیں پر رہائش کے لیے جنگلات کو صاف کیا گیا تو کہیں کھیتی باڑی کے لیے جنگلات کاٹے گئے یا پھر کارخانوں اور فیکٹریوں کو قائم کرنے کے لیے جنگلات کو ختم کیا گیا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کا یہ ہرا غلاف اترنے لگا جس کی وجہ سے آلودگی میں مزید اضافہ ہوا۔

.... بھلا ہم میں سے کون ہے جسے اپنی صحت عزیز نہ ہو۔ تو پھر یہ بے حسی کیسی ہے۔ ہم کیوں انتظار کریں کہ جب چیکنگ اور چالان شروع ہوں تبھی اپنی گاڑیوں اور کارخانوں کو درست کریں۔ اگر ہم کو اپنی صحت پیاری ہے اور اپنے ننھے منّے مسکراتے بچّوں کو صحت مند فضا مہیا کرنی ہے تو ہمیں یہ بے حسی اور لا پروائی چھوڑنی ہوگی۔ ورنہ یقین کریں کہ ہم اپنے معصوم بچوں کو ورثے میں ایک ایسی زہریلی فضا اور ماحول دیں گے جس میں وہ کبھی مسکرا نہ سکیں گے اور شاید اگلی نسل کی مسکراہٹ تو دیکھ بھی نہ سکیں۔ (تلخیص)

—— محمد اسلم پرویز

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

خام	:	کچّا
دھات سازی	:	دھات بنانے والا
کان کنی	:	کان کھودنا
مکین	:	مکان میں رہنے والا
تحلیل ہونا	:	گھل جانا، حل ہوجانا
کثافت	:	میل کچیل، گندگی
فُضلہ	:	کچرا، کسی چیز کا بیکار حصہ

غور کرنے کی بات:

○ اس مضمون میں مصنف نے معاشرے کے ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔آج جانے یا انجانے ہم اپنے ماحول کو بگاڑ رہے ہیں اور اپنے لیے بہت سے خطرات پیدا کر رہے ہیں مگر ہم میں سے اکثر اس سے بے خبر ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ ''صنعتی انقلاب'' سے ہمارے قدرتی وسائل کس طرح متاثر ہوئے ہیں؟ بیان کیجیے۔
2۔ 'تیزابی بارش' کسے کہتے ہیں؟ اس کے اسباب پر روشنی ڈالیے؟
3۔ ہمیں اپنے ماحول کو بچانے کے لیے کیا کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟
4۔ ماحول بچانا کیا صرف سائنس دانوں ہی کا کام ہے یا ہر شہری کا۔مختصراً لکھیے۔

عملی کام:

○ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ماحول بچاؤ تحریک شروع کریں۔لوگوں کو پیڑ پودے لگانے،آلودگی کو کم کرنے،گاڑیوں اور کارخانوں کی زہریلی گیسوں کو دور کرنے کے لیے تاکید کریں۔ایک پوسٹر بنائیے جس پر مختلف رنگوں سے لکھیے:

''بچوں کی مسکان بچائیں
آؤ ہم ماحول سجائیں''

© NCERT not to be republished

حصۂ نظم

- غزل
- نظم
- رباعی

© NCERT not to be republished

غزل

عام طور پر غزل سے شاعری کی وہ صنف مراد لی جاتی ہے جس میں عورتوں سے یا محبوب سے باتیں کی گئی ہوں، گویا کہ بنیادی طور پر غزل کی شاعری عشقیہ شاعری ہے ۔عاشقانہ مضامین اور غنائیت غزل کی خاص پہچان ہے۔لیکن آہستہ آہستہ غزل میں دوسرے مضامین بھی داخل ہوتے گئے ۔آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ غزل میں تقریباً ہر طرح کے مضامین بیان کیے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل آج بھی اُردو کی سب سے زیادہ مقبول صنفِ سخن ہے۔غزل کا ہر شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے مکمل ہوتا ہے۔اسی لیے سب سے زیادہ یاد رہ جانے والے اشعار بھی غزل کے ہی ہوتے ہیں۔

جس طرح غزل میں مضامین کی قید نہیں ہے اسی طرح اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں ہے۔غزل میں عام طور پر پانچ یا سات شعر ہوتے ہیں لیکن کئی غزلوں میں زیادہ اشعار بھی ملتے ہیں۔کبھی کبھی ایک ہی بحر اور ردیف وقافیہ میں شاعر ایک سے زیادہ غزلیں کہہ دیتا ہے۔اس کو ''دوغزلہ''، ''سہ غزلہ'' اور ''چہار غزلہ'' کہا جاتا ہے۔

غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں مطلع کہلاتا ہے۔غزل میں ایک سے زیادہ مطلعے بھی ہوسکتے ہیں۔ غزل بغیر مطلع کے بھی ہوسکتی ہے۔غزل کا وہ آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے اس شعر کو مقطع کہتے ہیں۔کبھی کبھی مطلع میں یا غزل کے درمیان بھی کسی شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال کر لیتا ہے لیکن ایسے شعر کو مقطع نہیں کہیں گے مثال کے طور پر میر تقی میرؔ کا یہ مطلع ؎

پھر موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

غزل کا سب سے اچھا شعر بیت الغزل یا شاہ بیت کہلاتا ہے۔جس غزل میں ردیف نہ ہو اور شعر قافیے پر ہی ختم ہو جاتے ہوں اس غزل کو غیر مردّف غزل کہتے ہیں۔

© NCERT not to be republished

مرزا محمد رفیع سوداؔ

(1713 – 1781)

مرزا محمد رفیع نام، سوداؔ تخلص تھا۔ اُن کے والد بغرضِ تجارت کابل سے دہلی آئے اور یہیں آباد ہوگئے۔ سوداؔ دلّی میں پیدا ہوئے اور قدیم رسم و رواج کے مطابق عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بچپن ہی سے نہایت ذہین اور موزوں طبع تھے۔ ابتدا میں فارسی اشعار کہے اور کچھ دن سلیمان قلی خاں وِدّادؔ کو اپنا کلام دکھایا۔ اس کے بعد شاہ حاتمؔ کے باقاعدہ شاگرد ہوئے۔

سوداؔ کی شاعری کا شہرہ سُن کر نواب شجاع الدّولہ نے ''برادرِ من، مشفق من'' لکھ کر انھیں لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ سوداؔ اس وقت تو نہ جا سکے، مگر کچھ عرصے کے بعد حالات نے انھیں دلّی چھوڑ کر لکھنؤ جانے پر مجبور کر دیا۔ یہاں نواب شجاع الدّولہ اور ان کے بیٹے نواب آصف الدّولہ کے زمانے میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور لکھنؤ میں ہی انتقال کیا۔

سوداؔ نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مگر قصیدہ گوئی اور ہجو نگاری میں اُن کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اُن کے قصائد اپنے پرشکوہ لب و لہجے، مضامین کی تازگی، خیال کی بلندی، کلام کی چستی اور بندش کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اردو قصیدے کی تاریخ میں کوئی بھی دوسرا شاعر سوداؔ کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔ سوداؔ کے بعد قصیدہ نگاری میں دوسرا بڑا نام ذوقؔ کا ہے۔

سوداؔ مزاجاً قصیدے کے شاعر ہیں۔ لیکن اُن کی غزلیں زبان و بیان کی صفائی اور لہجے کے تیکھے پن کی وجہ سے اپنی خاص پہچان رکھتی ہیں۔

© NCERT not to be republished

5012CH12

غزل

بہار، بے سپرِ جام و یار گزرے ہے
نسیم تیر سی چھاتی کے پار گزرے ہے
گزر مرا، ترے کوچے میں گو نہیں نہ سہی
مرے خیال میں توؔ لاکھ بار گزرے ہے
کہے ہے آج ترے در پہ اضطراب نسیم
کہ اس جہاں سے کوئی خاکسار گزرے ہے
میں وہ نہیں کہ کوئی مجھ سے مل کے ہو بد نام
نہ جانے ! کیا تری خاطر میں یار گزرے ہے
گزر مرا تیرے کوچے سے یوں ہے اے ظالم
کہ جیسے ریت سے پانی کی دھار گزرے ہے
مجھے تو دیکھ کے جوش و خروش سوؔدا کا
اسی ہی فکر میں لیل و نہار گزرے ہے

(ق)

یہ آدمی ہے کہ سر مارتا پھرے ہے بہ سنگ
کہ موجِ تند سرِ کوہسار گزرے ہے

ـــــ مرزا محمد رفیع سوؔدا

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

بے سپر	:	بغیر ڈھال کے مراد بغیر کسی بچاؤ کے
نسیم	:	صبح کی خوش گوار ہوا
اضطراب	:	بے چینی، بے قراری
خاکسار	:	خاک کی مانند، عاجز، حقیر
جوش و خروش	:	بہت زیادہ جوش اور تیزی
لیل و نہار	:	رات اور دن
بہ سنگ	:	پتھر سے
موجِ تند	:	تیز لہر، تیز جھونکا
کوہسار	:	پہاڑی یا پہاڑی سلسلہ

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

○ جب شاعر غزل کے کسی شعر کے دو مصرعوں میں اپنی بات مکمل کرنے سے قاصر رہتا ہے تو وہ اسے چار یا اس سے زیادہ مصرعوں میں پھیلا کر بیان کرتا ہے ایسے اشعار کو قطعہ بند کہتے ہیں۔ جیسے سوؔدا کی اس غزل کے آخری چار مصرعے قطع بند ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ ''نسیم تیری چھاتی کے پار گزرے ہے'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2۔ ''میں وہ نہیں کہ کوئی مجھ سے مل کے ہو بدنام'' سے شاعر کا کیا مطلب ہے؟

3۔ مقطعے کے قطعہ بند اشعار میں شاعر نے اپنی کس کیفیت کا اظہار کیا ہے؟

عملی کام:

- اس غزل کے اشعار میں شاعر نے جہاں جہاں اضافت کا استعمال کیا ہے ان کی نشاندہی کیجیے۔
- اس غزل کے قافیوں کی فہرست بنایئے۔

© NCERT not to be republished

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

(1789 – 1854)

شیخ محمد ابراہیم نام اور ذوقؔ تخلص تھا۔ ذوقؔ نے ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول سے حاصل کی۔ اسی زمانے میں شاعری کا شوق پیدا ہوا اور اپنے وقت کے مستند استاد شاہ نصیر کے شاگردوں میں شامل ہوگئے۔ رفتہ رفتہ مشقِ سخن اور اپنی ذہانت کے باعث وہ بہت کم عمری میں استادی کے مرتبے کو پہنچ گئے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی استادی کا فخر بھی حاصل ہوا اور خاقانیِ ہند اور ملک الشعرا کے خطابات سے سرفراز کیے گئے۔ بادشاہ کی سرپرستی میں ذوقؔ کی زندگی آرام و آسایش سے بسر ہوئی۔

ذوقؔ کو موسیقی اور علمِ نجوم سے کافی دل چسپی تھی۔ عربی و فارسی اور دیگر مشرقی علوم کے عالم تھے۔ لیکن ان کا اصل کمال ان کی شاعری سے ظاہر ہوا۔ شاعری ان کی معاش کا ذریعہ بنی اور یہی فن اُن کی قدر و قیمت کا وسیلہ بھی ثابت ہوا۔

ذوقؔ نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، قصیدہ ان کا اصل میدان ہے۔ اس صنف میں صرف سوداؔ ان سے آگے ہیں۔ انھوں نے اپنے قصیدوں میں شوکتِ الفاظ، بلند خیالی اور معنی آفرینی کے ساتھ مختلف علوم کی اصطلاحات سے بھی کام لیا ہے۔

غزل گوئی میں بھی ذوقؔ کا ایک خاص مقام ہے۔ زبان پر قدرت، بیان کی سلاست، روزمرہ اور محاورے پر اپنی گرفت کے لحاظ سے وہ ممتاز ہیں۔

© NCERT not to be republished

5012CH13

غزل

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں، ابھی آئے ابھی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہے، ہو وہی
دانش تری، نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یوں ہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوقؔ
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

—— شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

حیات	:	زندگی
قضا	:	موت، حکم خدا
بساط	:	چوسر اور شطرنج کھیلنے کا کپڑا یا تختہ
بدقمار	:	وہ جواری جو غلط چال یا داؤ چلے
بوقتِ مرگ	:	موت کے وقت
فغاں	:	آہ و زاری، واویلا
نازاں	:	ناز کرنے والا، فخر کرنے والا
خرد	:	عقل
دانشوری	:	عقلمندی، دانائی، حکمت
بادِ صبا	:	صبح کی ٹھنڈی ہوا، پُروائی

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- دوسرے شعر میں ''دل لگے'' اور ''دل لگی'' نے شعر میں بیان کا حسن پیدا کر دیا ہے۔
- کلام میں جب کسی تاریخی واقعے یا کسی شخصیت کا ذکر ہوتا ہے تو اسے صنعتِ تلمیح کہتے ہیں۔ یہاں حضرت خضرؑ کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت خضرؑ اپنی لمبی عمر کے لیے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ قیامت تک زندہ رہیں گے اور بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتے رہیں گے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ اس غزل کے مطلع کا مطلب لکھیے۔

2۔ عمرِ خضرؑ سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

3۔ ''ہم کیا رہے یہاں، ابھی آئے ابھی چلے'' اس مصرعے کے ذریعے شاعر نے انسانی زندگی کے کس پہلو کی نشاندہی کی ہے؟

4۔ غزل کے مقطع میں چمن سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

عملی کام:

○ اس غزل کے کچھ شعر زبانی یاد کیجیے اور بلند آواز سے پڑھیے۔

© NCERT not to be republished

شادؔ عظیم آبادی

(1846 – 1927)

علی محمد شادؔ عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ گھر پر عربی فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصے تک انگریزی بھی پڑھی۔ علوم اسلامی کی تحصیل کے ساتھ ساتھ انھوں نے عیسائیوں، پارسیوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔

نثر و نظم دونوں میں شادؔ نے کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ہیں۔ شادؔ کی غزلوں کا دیوان ان کی وفات کے بعد 1938 میں ''نغمۂ الہام'' کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں ان کی خودنوشت اور متعدد مجموعے منظرِ عام پر آئے۔

شاد نے مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور دوسری اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی شہرت کا اصل باعث اُن کی سادہ، مترنم اور شیریں غزلیں ہیں۔

© NCERT not to be republished

5012CH14

غزل

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم
اے شوق پتا کچھ تو ہی بتا اب تک یہ کرشمہ کچھ نہ کھلا
ہم میں ہے دل بے تاب نہاں، یا آپ دلِ بے تاب ہیں ہم
ہے دل میں تڑپتے جی بھر کر پر ضعف نے مشکیں کس دی ہیں
ہو بند اور آتش پر ہو چڑھا سیماب بھی وہ سیماب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریاے محبت کہتا ہے، آ، کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں ، منزل پہ پہنچتے ہیں دو اک
اے اہل زمانہ قدر کرو، نایاب نہیں کم یاب ہیں ہم
مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ! یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ، جو تم کو آنا ہو، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

— شادؔ عظیم آبادی

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

نایاب	:	جس کا پانا ممکن نہ ہو، انتہائی قیمتی
تعبیر	:	معنی، تفسیر
ہم نفسو	:	مراد بہت سے دوست، آشنا، رفیق
نہاں	:	چھپا ہوا، پوشیدہ
پایاب	:	اتنا پانی جسے چل کر پار کیا جا سکے، اتھلا پانی، کم پانی
کم یاب	:	جو چیز کم پائی جائے
مرغانِ قفس	:	پنجرے میں قید پرندے
شاداب	:	ہرا بھرا، سرسبز، تر و تازہ
ضعف	:	کمزوری
مشکیں کسنا	:	ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دینا مراد بے بسی، مجبوری
سیماب	:	پارہ

غور کرنے کی بات:

- غزل کے تیسرے شعر میں شاعر نے اپنی بے بسی کو اس پارے (سیماب) سے تشبیہ دی ہے جو آگ پر رکھے ہوئے برتن میں بند ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ ''نایاب ہیں ہم'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

© NCERT not to be republished

2۔ غزل کے پانچویں شعر کی وضاحت کرتے ہوئے نایاب اور کم یاب کا فرق بیان کیجیے۔

3۔ 'حیرت وحسرت کے مارے' شاعر سے، دریائے محبت کیا کہتا ہے؟

عملی کام:

- یہ غزل زبانی یاد کیجیے۔
- غزل کے قافیوں کی نشان دہی کیجیے۔
- غزل کے ان دو اشعار کی نشان دہی کیجیے جس میں غزل کی ردیف 'ہم' شاعر کے بجائے کسی اور کے لیے استعمال کی گئی ہو۔

© NCERT not to be republished

فآنی بدایونی

(1879 – 1941)

شوکت علی خاں نام، پہلے شوکت اور بعد میں فآنی تخلص اختیار کیا۔ اتر پردیش کے ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد پولس کے محکمے میں انسپکٹر تھے۔فآنی نے 1897 میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔1901 میں بریلی کالج بریلی سے بی۔اے۔ پاس کرنے کے بعد ملازمت اختیار کی۔ کچھ عرصے تک مدرس رہے، بعد میں ملازمت ترک کردی اور 1908 میں ایم۔اے۔او کالج، علی گڑھ (موجودہ مسلم یونیورسٹی) سے ایل ایل۔بی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اِس کے بعد لکھنؤ، آگرہ، اٹاوہ، بریلی اور بدایوں میں وکالت کی، لیکن فآنی کو وکالت سے دل چسپی نہ تھی۔ اس لیے اِس پیشے میں انھیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔1932 میں مہاراجہ کشن پرشاد کی دعوت پر حیدر آباد پہنچے۔ مہاراجہ کے دربار سے وابستہ رہنے کے ساتھ ساتھ وہ حیدر آباد کے ایک سرکاری اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔ فآنی کے آخری ایام تنگ دستی اور پریشانی میں گزرے۔ان کا انتقال حیدر آباد میں ہوا۔ فآنی کا یہ مقطع اُن کی زندگی پر صادق آتا ہے:

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فآنی نے پہلی غزل 1890 میں یعنی گیارہ سال کی عمر میں کہی۔ ان کے والد شاعری کے خلاف تھے۔ اس لیے فانی چھپ کر شعر کہتے تھے۔ زیادہ تر کلام تلف ہوگیا، جو کچھ بچا وہ ''باقیاتِ فانی'' (1926) کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں دیگر اور مجموعے ''عرفانیاتِ فانی''(1939) اور ''وجدانیاتِ فانی''(1940) کے نام سے منظرِ عام پر آئے۔

فآنی کا شمار اُردو کے ممتاز غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ شاعری میں درد و غم کے مضامین کی کثرت کے باعث فآنی کو یاسیات کا امام کہا گیا ہے۔

© NCERT not to be republished

5012CH15

غزل

دنیا میری بلا جانے ، مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں، ہستی کی کیا ہستی ہے
آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے
جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی، ان داموں تو سستی ہے
جگ سونا ہے تیرے بغیر، آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی، اب بھی دنیا بستی ہے
آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے
دل کا اجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے
فانیؔ! جس میں آنسو کیا، دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

—— فانیؔ بدایونی

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

ہستی	:	وجود، زندگی
کال	:	قحط، کمی
سہل	:	آسان

غور کرنے کی بات:

- حسرت و یاس فانؔی کی شاعری کی بنیادی خصوصیات ہیں۔
- اس غزل میں فانؔی نے بعض جگہ ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جیسے ''مہنگی سستی''، ''موت ہستی'' وغیرہ ان متضاد الفاظ کے استعمال سے شعر کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔ الفاظ کے اس استعمال کو صنعت تضاد کہا جاتا ہے۔

© NCERT not to be republished

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ شاعر نے دل کو نرالی بستی کیوں کہا ہے؟

2۔ 'ہستی کی کیا ہستی ہے' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

3۔ 'بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے'، اس مصرعے میں پہلے لفظ بستی اور دوسرے لفظ بستی کے فرق کو واضح کیجیے۔

عملی کام:

- اس غزل کے قافیوں کی نشاندہی کیجیے۔
- ذیل کے الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

جگ بستی گھٹا سہل لہو کال

اصغرؔ گونڈوی

(1884 – 1936)

اصغر حسین نام اور اصغرؔ تخلص تھا۔ اصل وطن گورکھپور تھا۔ لیکن آپ کے والد جو قانون گو تھے، ملازمت کے سلسلے میں ایک طویل مدّت تک گونڈہ میں رہے۔ اس لیے آپ اصغرؔ گونڈوی کے نام سے مشہور ہوگئے۔

اصغرؔ ایک پرہیز گار انسان تھے، مگر ان کے مزاج میں رنگینی اور شگفتگی بھی تھی۔ طبیعت تصوّف کی طرف مائل تھی۔ الہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی کی ملازمت کے سلسلے میں ایک مدّت تک قیام رہا اور اکیڈمی کے سہ ماہی رسالے ''ہندوستانی'' کے ایڈیٹر رہے۔

اصغر کم گو شاعر تھے۔ ان کے کلام کے صرف دو چھوٹے چھوٹے مجموعے ''سرودِ زندگی'' اور ''نشاطِ روح'' شائع ہوئے۔ ان کے منفرد رنگ کی ابتدا ''نشاط روح'' سے ہوتی ہے۔ زبان و بیان اور خیالات دونوں اعتبار سے ان کا کلام بہت صاف ستھرا ہے۔ ان کے لب ولہجہ میں ایک خاص سنجیدگی، اسی کے ساتھ ساتھ سرشاری کی کیفیت، زبان و بیان میں ایک عالمانہ وقار اور خیالات میں پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ تصوف اور معرفت کے مضامین بہت عمدگی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔

© NCERT not to be republished

غزل

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا، اسے غمِ جاناں بنا دیا
میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی
جلووں کے ازدحام نے حیراں بنادیا
یوں مسکرائے ، جان سی کلیوں میں پڑگئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
اے شیخ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا
وہ شورشیں، نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنادیا
ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

© NCERT not to be republished

___ اصغر گونڈوی

مشق

لفظ و معنی:

آلامِ روزگار	:	الم کی جمع، دنیا کے غم
غمِ جاناں	:	محبوب کا غم
ازدحام (اژدہام)	:	ہجوم، بھیڑ
لب کُشا	:	منھ کھلا ہوا
بسیط	:	پھیلا ہوا، کشادہ
شورشیں	:	شورش کی جمع، ہنگامہ، بدامنی، افراتفری
نیشتر	:	چیرا لگانے والا چاقو، نشتر

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

○ لفظ ازدحام کو اژدہام لکھنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ یہ لفظ دونوں طرح درست سمجھا جاتا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ ''آلامِ روزگار'' کو شاعر نے اپنے لیے کس طرح آساں بنایا ہے، واضح کیجیے؟

2۔ کامیابِ دید اور محرومِ دید کی وضاحت کیجیے۔

3۔ ''جلوؤں کے اِزدحام'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

4۔ شاعر نے محبوب کی مسکراہٹ کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟

عملی کام:

- نیچے دیے گئے الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

بسیط شورش مختصر گلستاں

- اپنے استاد سے دریافت کر کے چند ایسے شعر لکھیے جس میں انسان کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔

© NCERT not to be republished

یاسؔ یگانہؔ چنگیزی

(1883 – 1956)

مرزا واجد حسین نام، پہلے یاسؔ تخلص کرتے تھے، بعد میں یگانہ ہو گئے۔ ابتدا میں مولوی سید علی خاں بیتابؔ سے اصلاحِ سخن لیتے تھے، بعد میں شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد ہو گئے۔ 1904 میں کلکتہ گئے، وہاں بیماری نے طول کھینچا تو علاج کے لیے لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ ہی میں شادی کی اور یہیں بس گئے۔ لکھنؤ کے زمانہ قیام میں کئی ہم عصروں سے ان کے معرکے رہے۔ لکھنؤ میں غالبؔ کے کلام کی مقبولیت کے باعث یگانہؔ مرزا غالبؔ کے خلاف ہو گئے۔ خود کو غالبؔ شکن کہتے تھے۔

ان کی شخصیت میں خود پسندی بہت تھی۔ آزادہ روی ان کے مزاج کی خاصیت تھی۔ کلام میں قوت اور زور کے ساتھ ساتھ تلخی بہت ہے۔ ان کی شاعری میں ایک خاص طرح کی انفرادیت کا رنگ حاوی ہے۔ بول چال کے ایسے الفاظ بھی جو ادبی زبان کا حصہ نہیں ہیں، معنی میں تیزی اور تندی لانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کی رباعیاں بھی مشہور ہیں۔ کلام کے مجموعے ''آیاتِ وجدانی'' اور ''گنجینہ'' کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کا کلیات اردو کے نامور محقق مشفق خواجہ نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

© NCERT not to be republished

غزل

ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا
ہوس نے شوق کے پہلو، دبائے ہیں کیا کیا
اسی فریب نے مارا، کہ کل ہے کتنی دور
اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا
کسی کے روپ میں تم بھی تو اپنے درشن دو
جہاں میں شاہ و گدا رنگ لائے ہیں کیا کیا
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
بلند ہو، تو کھُلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا
خوشی میں اپنے قدم چوم لوں، تو زیبا ہے
وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا
خدا ہی جانے یگانہؔ میں کون ہوں کیا ہوں
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

—— یاس یگانہؔ چنگیزی

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

ہوس	:	ایسی خواہش جو ختم ہونے میں نہ آئے، سب کچھ پا لینے کی خواہش
عبث	:	بے کار، فضول
درشن	:	دیدار، جلوہ
شاہ و گدا	:	بادشاہ اور فقیر
پستی	:	گراوٹ، نچلی سطح
زیبا	:	خوشنما، خوبصورت
لغزش	:	غلطی، بھول، خطا، لڑکھڑاہٹ

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- غزل کے مقطع میں یگانہ اپنے وجود کی اصلیت پر شک کرتے ہیں اور اس کے ساتھ خدا ہی جانے کہہ کر یہ واضح کر دیتے ہیں کہ وہ جو بھی ہیں خدا جانتا ہے۔ اس طرح اپنے آپ پر شک کرنا اور خدا ہی جانے کہنا نئی بات ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ مطلع میں ادب اور ہوس کے الفاظ سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2۔ شاعر کو کس فریب نے مارا؟ بیان کیجیے۔

3۔ ”کسی کے روپ میں تم بھی تو اپنے درشن دو“ شاعر یہ کس سے کہہ رہا ہے؟

عملی کام:

- بلندی اور پستی متضاد الفاظ ہیں۔ اس غزل سے ایسے اور متضاد الفاظ تلاش کرکے لکھیے۔
- پہاڑ کاٹنا ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہے، مشکل کام انجام دینا۔ آپ پانچ محاورے یاد کرکے لکھیے۔

© NCERT not to be republished

نظم

نظم کے معنی ''انتظام، ترتیب یا آرائش'' کے ہیں۔ عام اور وسیع مفہوم میں یہ لفظ نثر کے مدِّ مقابل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد پوری شاعری ہوتی ہے۔ اس میں وہ تمام اصناف اور اسالیب شامل ہوتے ہیں جو ہیئت کے اعتبار سے نثر نہیں ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں غزل کے علاوہ تمام اصناف میں کی جانے والی شاعری کو ''نظم'' کہتے ہیں۔ لیکن جب ہم نظم کو بطور منفرد شعری صنف کے دیکھتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بُنا جاتا ہے۔ خیال کا تدریجی ارتقا بھی نظم کی ایک خصوصیت ہے۔ طویل نظموں میں یہ ارتقا واضح ہوتا ہے۔ جب کہ مختصر نظموں میں یہ ارتقا واضح نہیں ہوتا اور اکثر و بیشتر ایک تاثّر کی شکل میں اُبھرتا ہے۔

نظم کے لیے نہ تو ہیئت کی کوئی قید ہے اور نہ موضوعات کی۔ چنانچہ اردو میں غزل اور مثنوی کی ہیئت میں بھی نظمیں کہی گئی ہیں۔ نظم گو شعرا کے یہاں ترکیب بند اور ترجیع بند کی ہیئت بہت مقبول رہی ہے۔ ان دنوں نظم معرّا، آزاد نظم اور نثری نظم کی ہیئت کا چلن عام ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے نظم کی چار قسمیں ہوسکتی ہیں:

© NCERT not to be republished

1. پابند نظم

ایسی نظم جس میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترکیب میں مقرّرہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو، پابند نظم کہلاتی ہے۔ نئے انداز کی ایسی نظمیں بھی، جن کے بندوں کی ساخت مروّجہ ہیئتوں سے مختلف ہو یا جن کے مصرعوں میں قافیوں کی ترتیب مروجہ اصولوں کے مطابق نہ ہو، لیکن ان کے تمام مصرعے برابر کے ہوں اور ان میں قافیے کا التزام پایا جائے، پابند نظمیں کہلاتی ہیں۔

2. نظم معرّا

ایسی نظم جس کے تمام مصرعے برابر کے ہوں مگر ان میں قافیے کی پابندی نہ ہو، نظم معرّا کہلاتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے نظم عاری بھی کہا ہے۔ آج کل اسے نظم معرّا ہی کہا جاتا ہے۔

3. آزاد نظم

ایسی نظم جس میں نہ تو قافیے کی پابندی کی جاتی ہے اور نہ اس کے تمام مصرعے برابر ہوتے ہیں۔ یعنی جس کے مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں تاہم اس نظم میں بحر کی پابندی کی جاتی ہے۔

4. نثری نظم

نثری نظم چھوٹی بڑی نثری سطروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں نہ تو ردیف اور قافیے کی پابندی ہوتی ہے اور نہ ہی وزن کی۔ آج کل نثری نظم کا رواج دنیا کی تمام زبانوں میں عام ہے۔

© NCERT not to be republished

اکبر الہ آبادی

(1846 – 1921)

سید اکبر حسین رضوی نام، اکبرؔ تخلص تھا۔ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ضلع شاہ آباد میں گزرا۔ 1855 میں اپنے خاندان کے ساتھ الہ آباد گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہاں پہلے ایک مکتب اور پھر جمنا مِشن اسکول میں داخل ہوئے لیکن 1857 کے انقلاب کے باعث تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ملازمت کی ابتدا عرضی نویسی سے کی۔ کچھ مدت کے بعد الہ آباد ضلع میں نائب تحصیلدار ہوگئے۔ ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کرکے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ منصف کے عہدے پر بھی مامور ہوئے۔ 1898 میں انھیں حکومت سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ اکبرؔ کی زندگی کا آخری زمانہ ذہنی وجسمانی تکالیف اور پریشانیوں میں گزرا۔ پچھتّر برس کی عمر میں الہ آباد ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اکبرؔ کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ انھوں نے عام رواج کے مطابق شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ کلام پر اصلاح غلام حسین وحیدؔ سے لی جو آتشؔ کے شاگرد تھے۔ اکبرؔ کے کلام میں غزلوں کی تعداد کافی ہے اور ان میں اتنی جان ہے کہ انھیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان کی انفرادیت ان کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں نظر آتی ہے۔ یہی شاعری ان کی دائمی شہرت کا باعث بنی اور اس میں کوئی دوسرا شاعر ان کا ہم سر نہ ہوسکا۔ اکبرؔ کی ظریفانہ شاعری محض ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ نہیں۔ انھوں نے اس کے ذریعے انگریزی تعلیم کے منفی اثرات اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر بھرپور وار کیے اور چھوٹی چھوٹی نظموں سے وہ کام لیے جو بڑی بڑی تقریروں سے نہیں لیا جاسکتا تھا۔ اکبر الہ آبادی اگرچہ طنزیہ اور مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی شاعری کا ایک بڑا حصّہ سنجیدہ شاعری پر مشتمل ہے۔ انھوں نے بہت سی نظموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔

© NCERT not to be republished

5012CH18

جلوۂ دربارِ دہلی

سر میں شوق کا سودا دیکھا　　دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا　　کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا　　اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا　　حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے　　گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے　　بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا اِک جنگل دیکھا　　اس جنگل میں منگل دیکھا
برھما اور ورنگل دیکھا　　عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری　　پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لَمپ سے جاری　　تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

ڈالی میں نارنگی دیکھی　　محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی بارنگی دیکھی　　دہر کی رنگا رنگی دیکھی

© NCERT not to be republished

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منھ کو اگر چہ لٹکا دیکھا دل دربار سے اٹکا دیکھا

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زرّیں جھولیں نور کا عالم میلوں تک وہ چم چم چم چم

پُر تھا پہلوئے مسجدِ جامع روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع سب کے سب تھے دید کے طامع

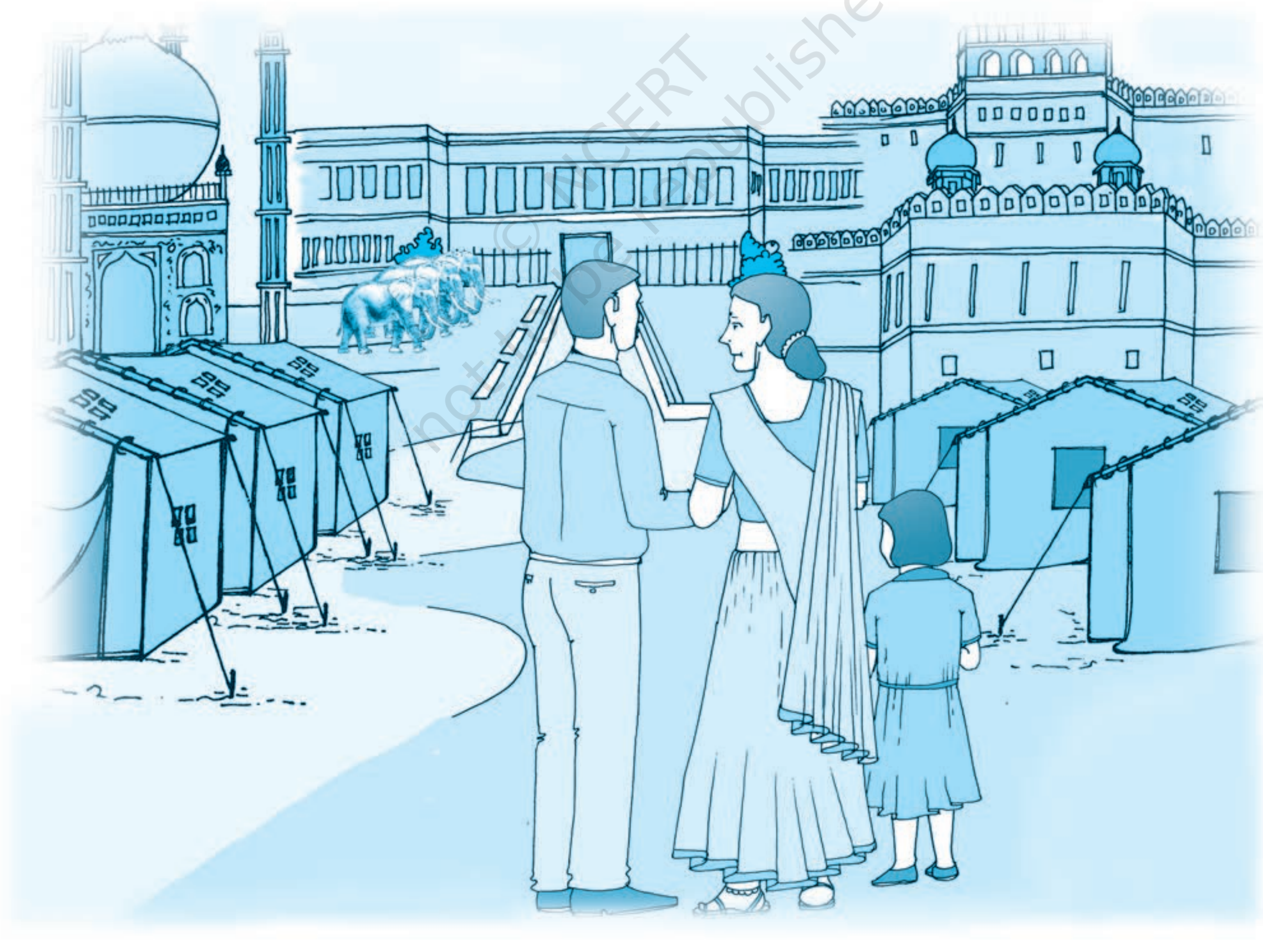

© NCERT not to be republished

سُرخی سڑک پہ کٹتی دیکھی   سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتش بازی چھٹتی دیکھی   لُطف کی دولت لٹتی دیکھی

چوکی اِک چولکھی دیکھی   خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی   شہد اور دودھ کی مکھی دیکھی

ایک کا حصہ منّ و سلوا   ایک کا حصہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا   میرا حصہ دور کا جلوا

اَوج برٹیش راج کا دیکھا   پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگِ زمانہ آج کا دیکھا   رُخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر   تحت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر   اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوجِ بخت ملاقی ان کا   چرخِ ہفت طباقی اُن کا
محفل اُن کی ساقی اُن کا   آنکھیں میری باقی اُن کا

ہم تو ان کے خیر طلب ہیں   ہم کیا، ایسے ہی سب کے سب ہیں
ان کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں   سب سامانِ عیش و طرب ہیں

—— اکبرالہ آبادی

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

جلوہ : نمائش
سنگینیں : سنگین کی جمع، ایک نوک دار ہتھیار جو بندوق کی نال پر لگایا جاتا ہے
برھما : کائنات کو پیدا کرنے والا
عزت خواہ : عزت چاہنے والا
دہر : دنیا
لامع : چمکنے والا، روشن
سامع : سننے والا
طامع : لالچ کرنے والا، لالچی
چولکھّی : چار لاکھ کا، مراد قیمتی
منّ و سلوا : وہ کھانا جو حضرت موسیٰ کی امت پر آسمان سے اترا تھا، مراد بہت لذیذ کھانا
اوج : بلندی، اونچائی، شان، عروج
پرتو : عکس، پرچھائیں
ملاقی : ملنے والا، ملاقات کرنے والا
چرخ : آسمان، فلک، چکر، پہیا
ہفت طباقی : سات طبق والا، مراد سات آسمان
طرب : خوشی، مسرت، شادمانی

غور کرنے کی بات:

- دسمبر 1898 میں لارڈ کرزن نئے وائسرائے کی حیثیت سے ہندوستان آئے۔ انھوں نے 1903 میں دہلی میں دربار کیا۔ اسی دربار پر اکبرالہ آبادی نے یہ نظم لکھی ہے۔

© NCERT not to be republished

- دوسرے بند میں لاٹ اور ڈیوک دو لفظ آئے ہیں ہندوستان میں لارڈ (Lord) کو عام لوگ لاٹ کہتے تھے۔ یہ برطانیہ کا اعزازی خطاب ہے۔اس کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہیں ۔گورنر یا حاکم صوبہ کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا تھا اسی طرح ڈیوک (Duke) بھی خطاب ہے نواب رئیس یا امیر کے لیے بھی یہ خطاب استعمال ہوتا تھا۔
- جنگل میں منگل ہونا محاورہ ہے۔جس کے لغوی معنی ہیں ویرانے میں عیش وعشرت کا سامان ہونا یا غیر آباد جگہ میں رونق اور چہل پہل ہونا ۔دربار دہلی کے موقع پر کشمیری گیٹ سے باہر کنگزوے کیمپ تک خیمے لگائے گئے تھے۔اس وقت یہ جگہ غیر آباد اور ویران تھی۔خیمے لگنے کے بعد جب دربار کے لیے لوگ یہاں آئے تو خوب رونق اور چہل پہل ہوگئی۔مصرعے میں اسی جانب اشارہ ہے۔
- اکبرالہ آبادی انگریزی الفاظ کا استعمال معنی خیز انداز میں کرتے ہیں ۔اس نظم میں بھی انھوں نے بہت سے انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ ’’سر میں شوق کا سودا دیکھا‘‘ سے کیا مراد ہے؟

2۔ ’’خیموں کا اک جنگل دیکھا‘‘ اس مصرعے میں شاعر نے کس منظر کی عکاسی کی ہے؟

3۔ ’’میرا حصّہ دور کا جلوہ‘‘ شاعر نے کیوں کہا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

عملی کام:

- اس بند کے ردیف اور قافیے کی نشاندہی کیجیے۔

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

© NCERT not to be republished

محمد اقبالؔ

(1877 – 1938)

اقبالؔ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے فارسی، عربی اور دینی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ سیالکوٹ ہی میں ایک انگریزی اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اسکاچ مشن اسکول سے ایف۔ اے کیا۔ لاہور میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں داغؔ کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ابتدا میں اقبالؔ نے خط و کتابت کے ذریعے ان سے اصلاح لی۔ لاہور ہی میں تعلیم کے دوران پروفیسر آرنلڈ سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ جب پروفیسر آرنلڈ انگلینڈ چلے گئے تو اُن کے اصرار پر اقبالؔ نے 1905 میں یورپ کا سفر کیا۔ وہاں فلسفے میں مزید مہارت پیدا کی اور فارسی ادب کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ اس کے بعد لندن واپس آ کر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ 1908 میں ہندوستان واپس آئے اور سرشتۂ تعلیمات سے وابستہ ہوگئے۔ اس کے بعد بیرسٹری شروع کردی۔ اقبالؔ کی عالم گیر مقبولیت اور علمی مرتبے سے متاثر ہوکر حکومتِ برطانیہ نے انھیں ''سر'' کا خطاب عطا کیا۔ اس کے علاوہ بھی انھیں مختلف اعزازات پیش کیے گئے۔ علامہ اقبالؔ نے ایک طویل علالت کے بعد لاہور میں انتقال کیا۔

علامہ اقبالؔ کی نگارشات میں انگریزی، اُردو اور فارسی نثر و نظم کا کثیر سرمایہ شامل ہے۔ اُردو میں ان کے شعری مجموعے ''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' ہیں۔ ''ارمغانِ حجاز'' ان کے اُردو اور فارسی کلام کا مشترک مجموعہ ہے۔ فارسی میں اقبالؔ کے کئی مجموعے ہیں۔

اقبالؔ نے شاعری کو پیغام کا ذریعہ بنایا تھا۔ ان کی فکر میں حرکت و عمل کا فلسفہ کارفرما ہے۔ اقبالؔ کے افکار میں فلسفۂ خودی کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ اقبالؔ کی مذہبی فکر بھی ان کی شاعری کا اہم جُز ہے۔ مغرب کی ذہنی غلامی سے آزادی کے خیالات ان کے یہاں نمایاں ہیں۔

© NCERT not to be republished

حقیقتِ حسن

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جو نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی، اختر سحر نے سنی

سَحَر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتادی زمیں کے محرم کو

بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہوگیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

—— محمد اقبالؔ

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

زوال	:	پستی، گراوٹ
تصویر خانہ	:	نگار خانہ، پکچر گیلری
شب دراز	:	لمبی رات
عدم	:	نہ ہونا
تغیر	:	تبدیلی
نمود	:	علامت، نشان، ظہور
اخترِ سحر	:	صبح کا ستارا
زمیں کے محرم	:	زمین کے رازدار
سوگوار	:	غمگین، افسردہ

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- اقبالؔ کی یہ نظم دنیا کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتی ہے اور تبدیلی کو کارخانۂ قدرت کا اصول سمجھتی ہے۔ کلی کا پھول بن جانا، موسمِ بہار کے بعد خزاں کا آنا اور شباب کے بعد بڑھاپے کی آمد، فطرت کے اسی اصول کے تحت واقع ہوتے ہیں۔
- اقبالؔ نے خدا اور حسن کے مکالمے کے ذریعے اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ دنیا کی ہر شے فنا ہونے والی ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ فنا اس کا مقدر ہے بلکہ زوال ہی میں اس کا حسن پوشیدہ ہے۔
- دنیا کی ہر شے مثلاً چاند، تارے، شبنم، کلی اپنے تمام تر حسن کے باوجود فانی ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ حسن نے خدا سے کیا سوال کیا ہے؟

2۔ خدا اور حسن کے درمیان گفتگو کی خبر زمین کے باسیوں کو کس طرح ہوئی ؟

3۔ پھول، کلی، موسمِ بہار اور شباب کو شاعر نے سوگوار کیوں کہا ہے؟

4۔ نظم کے آخری شعر کی تشریح کیجیے۔

عملی کام:

- قمر کے معنی ہیں چاند— اردو میں چاند کے لیے اور بھی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ہلال ، بدر، ماہ، مہہ اور مہتاب۔ اسی طرح سورج کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ لکھیے۔

© NCERT not to be republished

جوشؔ ملیح آبادی

(1898 – 1982)

شبیرؔ حسن خاں نام، تخلص جوشؔ اور وطن ملیح آباد تھا۔ پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ علم و ادب کی روایت خاندان میں بزرگوں سے چلی آ رہی تھی۔ جوشؔ کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ عربی و فارسی میں اچھی استعداد پیدا کی۔ اس کے بعد لکھنؤ، سیتا پور، آگرہ اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔

1916 میں والد کے انتقال کے بعد وہ کلکتہ (کولکاتہ) چلے گئے یہاں اُن کی ملاقات رابندر ناتھ ٹیگور سے ہوئی۔ ٹیگور کی شخصیت اور شاعری نے جوشؔ کو متاثر کیا۔ 1924 میں وہ عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدر آباد کے دارالترجمہ میں ناظر ادب کے عہدے پر ملازم ہوگئے۔ 1934 میں دہلی آ گئے جہاں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ''کلیم'' کے عنوان سے ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ اس کے بعد وہ پونا کی ایک فلم کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ آزادی کے بعد حکومتِ ہند کے رسالے ''آج کل''، دہلی کے مدیر مقرر ہوئے۔ 1955 میں انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اسلام آباد (پاکستان) میں ان کا انتقال ہوا۔

جوشؔ ملیح آبادی انتہائی قادر الکلام شاعر تھے۔ اُن کا پہلا مجموعۂ کلام ''روحِ ادب'' 1929 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اُن کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے جن میں ''شعلہ و شبنم''، ''حرف و حکایت'' اور ''سنبل و سلاسل'' قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کا آخری شعری کارنامہ نامکمل طویل نظم ''حرفِ آخر'' ہے۔ نثر میں اُن کی معروف کتاب اُن کی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' ہے۔

جوشؔ نے غزلیں اور رباعیاں بھی کہی ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ابتدا میں اُن کی نظموں کا موضوع فطرت کی تصویر کشی تھا جس کی وجہ سے انھیں شاعرِ فطرت کہا جاتا تھا۔ تحریکِ آزادی کے زیر اثر اُنھوں نے حب وطن کے گیت گائے اور سیاسی مسائل کو موضوع بنایا۔ اپنے ولولہ انگیز لب و لہجے کی وجہ سے ''شاعرِ انقلاب'' کہلائے۔

© NCERT not to be republished

5012CH20

گرمی اور دیہاتی بازار

دوپہر، بازار دُکاں، گاؤں کی خَلقت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں، روح فرسا لؤ کا زور
آگ کی رو، کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تند شعلے، سرخ ذرّے، گرم جھونکے، آفتاب
شور، ہلچل، غلغلہ ، ہیجان، لُو، گرمی، غُبار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گُڑ کی بو، مرچوں کی دھانس
خرپُزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھانس
دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رَو
کملیوں پر سرخ چانول، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو
گرم ذرّوں کے شدائد، جھکّڑوں کی سختیاں
جھکڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں
ماؤں کے کاندھے پہ بچے گردنیں ڈالے ہوئے
بھوک کی آنکھوں کے تارے، پیاس کے پالے ہوئے
بام و در لرزے ہوئے خورشید کے آفات سے
ہرنَفَس اک آنچ سی اُٹھتی ہوئی ذرّات سے

© NCERT not to be republished

مرد و زن گردش میں چیلوں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی رو میں چنے بھنتے ہوئے
یوں شعاعیں سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی
میان سے موسم کی تیغِ بے اماں نکلی ہوئی
لوُ کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی
دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی
آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
نشے میں مُمسِک کا جیسے وعدۂ جود و کرم

© NCERT not to be republished

ہر روش پر چڑ چڑاپن، ہر صدا میں بے رخی
ہر جگر بھنتا ہوا، ہر کھوپڑی پکتی ہوئی
سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پر عکس گناہ
تیز کرنیں، جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

_____ جوشؔ ملیح آبادی

مشق

لفظ و معنی:

خلقت	:	مخلوق مراد عام لوگ
روح فرسا	:	روح کو تکلیف دینے والا
رَو	:	بہاؤ، دھار
پیچ و تاب	:	غصّے کی کیفیت
تند	:	تیز
غلغلہ	:	شور، ہنگامہ
ہیجان	:	پریشانی، بے چینی
خر پزے	:	خر پزہ کی جمع، مراد خر بوزہ
شدائد	:	شدید کی جمع، سختیاں
آفات	:	آفت کی جمع، مصیبتیں
ہر نفس	:	ہر سانس

© NCERT not to be republished

گردش	:	چکّر
تیغ بے اماں	:	کھلی ہوئی تلوار جس کے وار سے بچنا مشکل ہو
بیگانگی	:	اجنبیت، بے تعلقی
سایۂ اشجار	:	درختوں کا سایہ
رَم	:	بھاگنا، دوڑنا
ممسک	:	کنجوس
وعدۂ جودوکرم	:	انعام واکرام کا وعدہ
روش	:	طور طریقہ
عکسِ گناہ	:	گناہ کی پرچھائیں
سودخوار	:	سود کھانے والا

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- جوشؔ کی یہ نظم بیانیہ ہے اور منظر نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔
- جوشؔ کو الفاظ کا جادوگر کہا جاتا ہے یہ نظم اس کی مثال ہے۔
- کسی خیالی یا مرئی چیز کو ٹھوس شکل میں پیش کرنا تمثیل کہلاتا ہے۔ اس نظم میں تمثیل کے کئی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''میان سے موسم کی تیغ بے اماں نکلی ہوئی''۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ شاعر نے دیہاتی بازار کی منظر کشی کس طرح کی ہے؟

2۔ دوستوں کی شکل پر بیگانگی کیوں نظر آرہی تھی؟

3۔ لؤ کو روح فرسا کیوں کہا گیا ہے؟

4۔ 'کافر دھوپ' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

عملی کام:

- درج ذیل الفاظ سے واحد کی جمع اور جمع سے واحد بنائیے۔

قطار سختیاں گردنیں گرمی اشجار روح آفات

- اس نظم میں استعمال ہونے والے محاوروں، تشبیہوں اور تمثیلوں کی نشاندہی کیجیے۔

© NCERT not to be republished

اختؔر شیرانی

(1905 – 1948)

داؤد خاں نام، اختؔر تخلص، مشہور محقق حافظ محمود خاں شیرانی کے بیٹے تھے۔ ٹونک میں پیدا ہوئے۔ تعلیم وتربیت لاہور میں ہوئی۔ یہاں ان کے والد اورینٹل کالج لاہور میں استاد تھے۔ اختؔر شیرانی نے لاہور کے کئی مشہور ادبی رسائل ''ہمایوں''، ''خیالستان''، ''شاہکار'' اور ''انتخاب'' میں ادارتی فرائض انجام دیے۔ جواں عمری میں انتقال ہوا۔

اختؔر ایک رومانی شاعر تھے انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ اپنی رومانی نظموں کے باعث زیادہ مشہور ہوئے۔ اختؔر کی نظموں میں غنائیت پائی جاتی ہے۔ وہ لطیف جذبات مترنم انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں سرشاری اور سرمستی ہے۔ اختؔر کی رومانیت خواب وخیال سے زیادہ ہماری دھرتی اور اس کے حسن کے گرد گھومتی ہے اس لیے مانوس معلوم ہوتی ہے۔ اختؔر نے رومانی نظموں کے علاوہ سانیٹ بھی لکھے۔ ان کی نظموں کا دوسرا موضوع حب الوطنی ہے۔ ان کی نظمیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبت اور وطن کی خاطر کسی بھی قربانی کے لیے تیار ہیں۔

''پھولوں کے گیت''، ''شعرستان''، ''صبح بہار''، ''نغمۂ حرم''، ''طیورِ آوارہ''، ''اختر ستان''، ''لالۂ طور''، ''شہ رو''، اور ''شبستان'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔

© NCERT not to be republished

اُودیس سے آنے والے بتا!

(ایک نو وارد ہم وطن سے کسی غریب الوطن کا خطاب)

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا   کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا!   کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن   وہ سروِ وطن، ریحانِ وطن

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں   مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر   گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں   ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا شام پڑے گلیوں میں وہی   دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے؟
اور سڑکوں کی دُھندلی شمعوں پر   سایوں کا بسیرا ہوتا ہے
باغوں کی گھنیری شاخوں میں   جس طرح سویرا ہوتا ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

© NCERT not to be republished

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی مہکتے مندر سے ناقوس کی آواز آتی ہے؟
کیا اب بھی مقدّس مسجد پر مستانہ اذاں تھرّاتی ہے؟
اور شام کے رنگیں سایوں پر عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا آم کے اُونچے پیڑوں پر اب بھی وہ پپیہے بولتے ہیں؟
شاخوں کے حریری پردوں میں نغموں کے خزانے کھولتے ہیں؟
ساون کے رسیلے گیتوں سے تالاب میں امرس گھولتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا پہلی سی ہے معصوم ابھی وہ مدرسے کی شاداب فضا؟
کچھ بھولے ہوئے دن گزرے ہیں جس میں، وہ مثالِ خواب فضا؟
وہ کھیل، وہ ہم سِن، وہ میداں وہ خواب گہِ مہتاب فضا؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی کسی کے سینے میں باقی ہے ہماری چاہ بتا؟
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب یاروں میں کوئی آہ بتا؟
او دیس سے آنے والے بتا لِلّٰہ بتا، لِلّٰہ بتا؟

او دیس سے آنے والے بتا!

© NCERT not to be republished

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا ہم کو وطن کے باغوں کی   مستانہ فضائیں بھُول گئیں؟
برکھا کی بہاریں بھول گئیں   ساون کی گھٹائیں بھُول گئیں؟
دریا کے کنارے بھُول گئے   جنگل کی ہوائیں بھُول گئیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا گاؤں پہ اب بھی ساون میں   برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں؟
معصوم گھروں سے بھور بھئے   چکّی کی صدائیں آتی ہیں،
اور یاد میں اپنے میکے کی   بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

© NCERT not to be republished

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی پرانے کھنڈروں پر   تاریخ کی عبرت طاری ہے؟
اَن پورنا کے اُجڑے مندر پر   مایوسی و حسرت طاری ہے؟
سنسان گھروں پر چھاؤنی کے   ویرانی و رِقّت طاری ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

—— اختر شیرانی

مشق

لفظ ومعنی:

نو وارد : نو کے معنی نیا، وارد آنے والا، نیا آیا ہوا مسافر
آوارۂ غربت : پردیس میں رہنے والا
کَنعان : ملک شام کا ایک مقام جہاں حضرت یوسفؑ پیدا ہوئے تھے
فردوس : جنت
ریحان : ایک خوشبودار پھول
ناقوس : سنکھ جو پوجا کرتے وقت مندر میں بجایا جاتا ہے
حریری : ریشمی، ریشم کا باریک کپڑا
امرس : آم کا رس مراد مٹھاس
ہم سِن : ہم عمر، ہم جولی
خواب گہ : خواب گاہ، سونے کا کمرہ
ان پورنا : درگا دیوی، غذا کی دیوی

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- اس نظم میں شاعر نے پردیس میں رہنے والے لوگوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے کہ کس طرح انھیں پردیس میں اپنے دیس کی ایک ایک چیز یاد آتی ہے۔
- نظم کے آخری بند میں عروج و زوال کی کہانی کو شاعر نے تین مصرعوں میں سمو دیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ قلعہ و حویلیاں بارونق ہوتی تھیں مگر جب ان کے مکیں نہیں رہے تو اُن کے مکان سونے ہو گئے اور وہ کھنڈر میں تبدیل ہو گئے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ نظم کے پہلے بند میں ''آوارۂ غربت'' اور ''کنعانِ وطن'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
2۔ پردیس میں وطن سے آنے والے شخص سے شاعر بے تاب ہو کر کیا کیا پوچھتا ہے؟
3۔ ''او دیس سے آنے والے بتا للہ بتا للہ بتا'' سے شاعر کے کس احساس کا اظہار ہو رہا ہے؟
4۔ شاخوں کے حریری پردوں میں نغموں کے خزانے کون کھولتا ہے؟

عملی کام:

- نظم میں شامل تلمیحات اور استعارات کی نشاندہی کیجیے۔
- اپنے وطن کی خوبیوں پر ایک مضمون لکھیے۔

© NCERT not to be republished

کیفی اعظمی

(1917 – 2002)

نام اطہر حسین رضوی اور تخلص کیفی۔ اعظم گڑھ کے گاؤں رجواں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اس کے بعد لکھنؤ کے مشہور ادارے سلطان المدارس میں داخل ہوئے۔ کیفی اعظمی کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ کیفی اعظمی کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے اس سلسلے میں کئی بار جیل گئے۔ 1943 میں بمبئی آگئے اور یہاں ایک رسالے ''قومی جنگ'' کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی فلمی دنیا سے بھی ان کی وابستگی رہی اور کئی فلموں کے نغمے اور مکالمے لکھے۔ ان کی شاعری کے مجموعوں میں ''جھنکار'' (1945)، ''آخرِ شب'' (1947)، ''آوارہ سجدے'' (1973)، ''ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس)'' (1977) اور ''سرمایہ'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے فلمی نغموں کا مجموعہ ''میری آواز سنو'' 1974 میں منظر عام پر آیا۔ ''آوارہ سجدے'' پر انھیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

© NCERT not to be republished

آندھی

اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے
اُفَق پر برق سی لہرا رہی ہے
قیامت ہر طرف منڈلارہی ہے
زمیں ہچکولے پیہم کھارہی ہے
اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے

© NCERT not to be republished

مچلتی ، جھومتی ، ہلچل مچاتی
تڑپتی، شور کرتی، دل ہلاتی
گرجتی، چیختی، فتنے اُٹھاتی
اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے

فضا میں آتشیں پرچم اُڑاتی
زمیں پر آگ کے دھارے گراتی
شرارے رولتی شعلے بچھاتی
سنہری روشنی پھیلا رہی ہے
اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے

بڑھی آتی ہے تعمیری تباہی
جھکی پڑتی ہے نور افزا سیاہی
جھکولے کھا رہا ہے قصرِ شاہی
بلا زنجیرِ در کھڑکا رہی ہے
اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے

نشاناتِ ستم تھرّا رہے ہیں
حکومت کے علم تھرّا رہے ہیں
غلامی کے قدم تھرّا رہے ہیں
غلامی اب وطن سے جارہی ہے
اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے

——— کیفی اعظمی

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

قصرِ شاہی	:	شاہی محل
برق	:	بجلی
نشاناتِ ستم	:	ظلم کے نشانات
آتشیں پرچم	:	آگ جیسا جھنڈا مراد سرخ پرچم

غور کرنے کی بات:

- اس نظم کے ابتدائی دو بند ''آندھی'' کی شدّت اور زور کی منظرکشی کرتے ہیں۔ تیسرے بند سے اس نظم کا مرکزی خیال ابھرتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ ''آندھی'' درحقیقت ظلم وستم کے خلاف عوامی جدوجہد اور آزادی کے لیے انقلابی ماحول کی عکاس ہے۔
- اس نظم میں مرکب الفاظ اور تراکیب کا خوبصورت استعمال ہے جیسے آتشیں پرچم، تعمیری تباہی، نور افزا سیاہی، نشاناتِ ستم۔

© NCERT not to be republished

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ افق پر برق سی لہرانے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
2۔ آندھی آنے کے کیا آثار نظر آتے ہیں؟
3۔ تعمیری تباہی سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

عملی کام:

- اس نظم کو زبانی یاد کیجیے۔
- درج ذیل لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

فتنے شرارے زنجیر علَم

رباعی

رباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں ۔ اس کا پہلا ، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ تیسرا مصرع بھی ہم قافیہ ہوسکتا ہے۔ عام طور پر رباعی کا چوتھا مصرع سب سے زیادہ جاندار ہوتا ہے۔ جو پوری رباعی کی روح ہوتا ہے۔ قافیوں کی پابندی اور بحر کی پابندی ایسی شرطیں ہیں جن کا پورا ہونا رباعی کے لیے لازمی ہے۔ رُباعی کے لیے چند بحریں مخصوص ہیں۔

© NCERT
not to be republished

ببر علی انیسؔ

(1802 – 1874)

میر ببر علی نام، انیسؔ تخلص تھا۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ انیسؔ کے اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ اُن کے پردادا میر غلام حسین ضاحکؔ دہلی کی تباہی کے بعد اپنے بیٹے میر حسنؔ کے ساتھ دہلی چھوڑ کر فیض آباد چلے آئے تھے۔

میر انیسؔ کا مطالعہ وسیع تھا۔ عربی اور فارسی میں اچھی دستگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اُن تمام علوم سے خاطر خواہ واقف تھے جو اس زمانے میں رائج تھے۔ قرآن و حدیث، عروض، منطق، فلسفہ، طب، رمل وغیرہ سب میں انھوں نے اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی۔ اِن کے علاوہ وہ فنِ سپہ گری اور فنِ شہ سواری سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔

انیسؔ ایک قادرالکلام شاعر اور ماہر فن کار تھے۔ زبان پر انھیں بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ لفظوں کے انتخاب اور استعمال میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ایک بات کو کئی کئی ڈھنگ سے ادا کرنے میں ماہر تھے۔ مرثیے کے علاوہ رباعی کی صنف میں بھی انیسؔ نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی تھی۔

© NCERT not to be republished

(1)

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

—— انیسؔ

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

معدن	:	کان
کوہ	:	پہاڑ
دشت	:	جنگل
جا	:	جگہ

غور کرنے کی بات:

- اس رباعی میں انیسؔ نے باغ، صحرا، جنگل، پہاڑ اور دریا کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جدھر دیکھیے اللہ کی قدرت نظر آتی ہے۔ انسان حیران ہے کہ وہ اپنی دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ ’’گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں‘‘ سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2۔ قدرت کے جلووں کی کثرت نے شاعر پر کیا اثر ڈالا ہے؟

عملی کام:

- اس رباعی میں کچھ ایسے الفاظ آئے ہیں جن کے درمیان 'و' کا استعمال ہوا ہے جیسے 'معدن وکوہ'۔ دولفظوں کے اس طرح ملانے والے حرف 'و' کو حرفِ عطف کہتے ہیں۔ آپ ایسی پانچ تراکیب لکھیے جن میں حرف عطف کا استعمال کیا گیا ہو۔

5012CH24

(2)

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

—— انیسؔ

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

رتبہ	:	درجہ
فروتنی	:	عاجزی، انکساری
تہی مغز	:	خالی دماغ، احمق

ثنا	:	تعریف
ظرف	:	برتن
صدا	:	آواز

غور کرنے کی بات:

- دنیا میں انسان فطرتاً کئی طرح کے ہوتے ہیں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بڑے اور اچھے کام کرنے کے بعد اپنی تعریف بیان کرنا پسند نہیں کرتے۔ایسے لوگ بہت اعلیٰ ظرف کے مالک ہوتے ہیں۔لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ذرا سا کام کرنے کے بعد اپنی تعریف بیان کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔وہ یہ خواہش کرتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کے اس کام کو سراہیں۔ایسے لوگ کم ظرف کہلاتے ہیں۔ان کی مثال بالکل اس خالی برتن کی ہے جو ذرا سی ٹھیس سے بج اٹھتا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ دل میں فروتنی کو جا دینے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2۔ شاعر خالی ظرف کی صدا سے کیا سمجھانا چاہتا ہے؟

عملی کام:

- اس رباعی کو زبانی یاد کیجیے۔

© NCERT not to be republished

تلوک چند محرومؔ

(1887 – 1966)

تلوک چند نام، محرومؔ تخلص گجرانوالا میں پیدا ہوئے۔ تلوک چند محرومؔ کی زندگی کا بڑا حصہ درس و تدریس میں گزرا۔ محرومؔ نے اقبالؔ اور سرورؔ جہان آبادی کے کلام سے متاثر ہوکر نظمیں لکھیں۔ بیشتر نظمیں مناظر فطرت، حب الوطنی اور قومی اور سیاسی موضوعات پر ہیں۔ بچّوں کی ذہنی تربیت کے لیے محرومؔ نے متعدد نظمیں لکھی ہیں۔

محرومؔ نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی کہی ہیں اور رباعیاں بھی۔ محرومؔ صوفیانہ مزاج رکھتے تھے ۔ ان کے کلام میں عارفانہ مضامین، انسان دوستی، مذہب و اخلاق اور ہندو مسلم اتحاد جیسے موضوعات ملتے ہیں۔

ان کا پہلا مجموعہ ’’ کلام محرومؔ‘‘ کے عنوان سے 1916 میں شائع ہوا۔ بعد میں ’’ گنج معانی‘‘، ’’ کاروانِ وطن‘‘، ’’ رُباعیات محرومؔ‘‘ اور ’’نیرنگ معانی‘‘ وغیرہ شائع ہوئے۔

© NCERT not to be republished

(1)

فطرت کی دی ہوئی مسرت کھو کر
اوروں کو نہ کر ملول، غمگیں ہو کر
یہ عمر بہرحال گزر جائے گی
ہنس ہنس کر اِسے گزار یا رو رو کر

—— تلوک چند محرومؔ

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

مسرت	:	خوشی
ملول	:	اُداس، رنجیدہ
فطرت	:	قدرت، نیچر

غور کرنے کی بات:

- اس رباعی میں شاعر نے یہ پیغام دیا ہے کہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے ہمیں فیض حاصل کرنا چاہیے۔
- اس رباعی کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ زندگی کا سفر کسی نہ کسی طرح طے ہو جاتا ہے اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اسے ہنس کر گزار دیں یا رو کر۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ اس رباعی میں شاعر نے کیا پیغام دیا ہے؟

2۔ اس رباعی میں کون کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟

عملی کام:

- اس رباعی کو بلند آواز سے پڑھیے اور زبانی یاد کیجیے۔

5012CH26

(2)

مذہب کی زباں پر ہے نکوئی کا پیام
حسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی
مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

© NCERT not to be republished

—— تلوک چند محرومؔ

مشق

لفظ و معنی:

نکوئی	:	نیکی
راست گوئی	:	سچ بولنا
صلح جوئی	:	باہمی میل جول اور امن سے زندگی گزارنے کی کوشش
حُسنِ عمل	:	اچھے کام

غور کرنے کی بات:

- اس رباعی میں باہمی میل جول اور امن کے ساتھ زندگی گزارنے کا پیغام دیا گیا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ شاعر نے اس رباعی میں مذہب کے کس پیغام کا ذکر کیا ہے؟

2۔ حُسنِ عمل اور راست گوئی سے کیا مُراد ہے؟

عملی کام:

- نیچے دیے گئے الفاظ کے متضاد لکھیے۔

راست گوئی　　لڑائی　　نکوئی

© NCERT not to be republished

فراقؔ گورکھپوری

(1896 – 1982)

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپور (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ گھر میں شعر و شاعری کا چرچا عام تھا۔ ان کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرتؔ بھی مشہور شاعر تھے۔ فراقؔ نے تعلیم الہ آباد میں حاصل کی اور اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی اعلیٰ لیاقت حاصل کی۔ بعد میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔ کچھ مدت تک جواہر لعل نہرو کے ساتھ کام کیا۔ جیل بھی گئے۔ انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد ہو گئے۔ یہیں سے 1959 میں ریٹائر ہوئے۔

فراق گورکھپوری کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں ''روحِ کائنات''، ''رمز و کنایات''، ''غزلستان''، ''شبنمستان'' اور ''گلِ نغمہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ ''روپ'' بھی بہت مشہور ہے۔ اردو میں تاثراتی تنقید کے علمبرداروں میں فراق کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اندازے'' اور ان کی کتاب ''اردو کی عشقیہ شاعری'' بہت اہمیت رکھتی ہے۔

شاعری میں فراقؔ کی غزل اور ان کی رباعی کا انداز سب سے الگ ہے۔ انھوں نے رباعی کی صنف کو ہندوستانی ثقافت کا ترجمان بنا دیا۔

© NCERT not to be republished

(1)

اک حلقۂ زنجیر تو زنجیر نہیں
اک نقطۂ تصویر تو تصویر نہیں
تقدیر تو قوموں کی ہوا کرتی ہے
اک شخص کی قسمت کوئی تقدیر نہیں

——— فراؔق گورکھپوری

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

حلقہ : گھیرا، دائرہ

غور کرنے کی بات:

○ اس رباعی میں شاعر فرد کے بدلے قوم کی تقدیر بنانے کی بات کر رہا ہے۔ اور قوم کی تقدیر اسی وقت بن سکتی ہے جب سب لوگ مل کر کوشش کریں۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ شاعر کس طرح کی تقدیر میں یقین رکھتا ہے؟ اس رباعی کی روشنی میں جواب دیجیے۔

عملی کام:

○ اس رباعی میں تقدیر اور قسمت دو ہم معنی الفاظ استعمال ہوئے ہیں انھیں ''مترادف الفاظ'' کہتے ہیں، اسی طرح پانچ ہم معنی الفاظ لکھیے۔

(2)

ہر عیب سے مانا کہ جدا ہوجائے
کیا ہے اگر انسان خدا ہوجائے
شاعر کا تو بس کام یہ ہے ہر دل میں
کچھ دردِحیات اور سِوا ہوجائے

____ فراقؔ گورکھپوری

مشق

لفظ ومعنی:

عیب	:	خرابی، برائی،نقص
حیات	:	زندگی
سِوا	:	زیادہ

غور کرنے کی بات:

○ اس رباعی میں شاعر نے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کی بات کہی ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ انسان کا خدا ہوجانے سے کیا مطلب ہے؟

© NCERT not to be republished

2۔ ''کچھ دردِ حیات اور سوا ہو جائے'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

عملی کام:

- دردِ حیات میں اضافت کا استعمال ہوا ہے، آپ اسی طرح اضافت والے پانچ الفاظ لکھیے۔

© NCERT not to be republished

آؤ مل جل کر
بنائیں ایک بہتر دنیا

نرمالیہ چکروتی، کالج آف آرٹ، نئی دہلی

© NCERT not to be republished